ماہنامہ

آنکھ مچولی

کراچی

نومبر ۱۹۸۹ء

چھ ہزار روپے بطور اسکالرشپ حاصل کیجیے

تفصیل اندر دیکھیں

ADARTS

Scanner AFI-2/86

آئیے!

بڑوں کو سمجھائیں سگریٹ نہ سلگائیں

سگریٹ وہ غیر محسوس زہر ہے جو ہماری زندگی کو گھن کی طرح چاٹ جاتا ہے اور بالآخر موذی امراض اور تکلیف دہ موت کے انجام سے دوچار کرتا ہے۔

سگریٹ نشہ ہے جو ہم سے ہماری فعال اور متحرک زندگی چھین کر ہمیں سستی، کاہلی اور بے ہمتی کے روگ دیتا ہے۔

سگریٹ وہ لت ہے جو مضبوط ارادوں اور آہنی عزائم کے قلعوں کو مسمار کر دیتا ہے۔

سگریٹ پینے والے کبھی شاہین صفت نہیں ہو سکتے سگریٹ کا دھواں نگلنے والے ہمیشہ صحت مند نہیں رہ سکتے۔

یاد رکھیے ہمارے اطراف جب کوئی سگریٹ پی رہا ہوتا ہے تو اُس کا دھواں اُسی کی رگوں میں اندھیرے نہیں بھرتا بلکہ ہماری سانسوں میں شامل ہو کر ہماری رگ و پے میں بھی اُترتا ہے۔ **تو پھر ـــــ ہم احتجاج کیوں نہ کریں** سگریٹ پینے والے اپنے بزرگوں کو کیوں نہ سمجھائیں کہ سگریٹ انہی کی نہیں ہماری بھی قاتل ہے۔ اچھے لہجے میں، شائستہ طریقے سے مہذب بچوں کی طرح... آئیے اپنے بڑوں کے ہاتھ سے سگریٹ لے کر پھینک دیں اور ان کی درازیٔ عمر کی دعائیں مانگیں آنکھ مچولی کی "سگریٹ چھوڑ تحریک" میں شامل ہو کر اسے موثر بنائیے۔

سگریٹ نوشی کے خلاف جو اسٹیکر ہم آپ کو دے رہے ہیں اسے ایسی نمایاں جگہ پر چسپاں کریں جہاں سگریٹ نوش بزرگ یا نوجوان اسے پڑھ سکیں اور یوں آپ کا پیغام اُن تک پہنچ جائے ۔ اور ہاں! وزارت صحت اسلام آباد کو بھی آپ سب خط لکھئے کہ حکومت سگریٹ کے اشتہارات پر پابندی لگا دے۔ قومی صحت کو تباہ کرنے والے اشتہارات پر پابندی بھی ضروری ہے۔

آنکھ مچولی اسکالرشپ کی ایک نئی قندیل
کیسے حاصل ہوگی ؟ نیچے دیکھیں یہ تفصیل

آنکھ مچولی کے قارئین اور ملک بھر کے اہلِ علم حضرات کی جانب سے
آنکھ مچولی کی پہلی تعلیمی اسکالرشپ کی بے پناہ پسندیدگی کے بعد
آنکھ مچولی کی جانب سے ملک بھر کے طلباء و طالبات کیلئے

پہلے سے بڑھ کر

چھ ہزار روپے کی خطیر رقم بطورِ اسکالرشپ

یہ چھ خوش نصیبوں کے لئے ایک ایک ہزار روپے کے ۶ تعلیمی وظائف

واضح رہے کہ ۳ اسکالرشپ طالبات اور ۳ طلباء کے لئے مخصوص ہیں

اسکالرشپ کے حصول کے لئے قواعد ضوابط جن کی پابندی لازمی ہے

- ضروری ہے کہ آپ اسکول یا کالج کے طالب علم ہوں۔
- اسکالرشپ کا کوپن ۳۰ نومبر ۱۹۸۹ء سے قبل ہمیں بذریعہ ڈاک بھجوا دیجئے۔
- فی الوقت کوپن کے ساتھ شناختی کارڈ کی فوٹو کاپی یا سرٹیفکیٹ کی ضرورت نہیں۔
- جنوری ۱۹۹۰ء کے "خوفناک نمبر" میں پانچ خوش نصیبوں کے ناموں کا اعلان

دیکھنے کے بعد صرف انہی خوش قسمت ۶ طلباء و طالبات کے لئے لازم ہوگا کہ وہ اپنے تعلیمی ادارے کے شناختی کارڈ کی فوٹو کاپی اور تعلیمی ادارے کے سربراہ سے تصدیقی سرٹیفکیٹ لے کر بھجوائیں۔ بصورتِ دیگر اسکالرشپ روانہ نہیں کی جاسکے گی۔

اگر آپ سمجھتے ہیں کہ اسکالرشپ کے لئے آپ سے زیادہ موزوں کوئی اور ہے تو کوپن اُس کے نام سے پُر کر دیجئے۔ آپ کا یہ جذبہ قابلِ قدر اور اللہ تعالیٰ کے ہاں اجر و ثواب کا باعث ہوگا

نام مع ولدیت ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ عمر ـ ـ ـ ـ ـ ـ کلاس ـ ـ ـ ـ ـ ـ

تعلیمی ادارے کا نام ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ

گھر کا پتا ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ فون نمبر (اگر ہو) ـ ـ ـ ـ

ہمارا پتا:- آنکھ مچولی اسکالرشپ اسکیم ۱۱۲، ڈی سائٹ کراچی ۱۶

● ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی تمام تحریروں کے جملہ حقوق بحقِ ادارہ محفوظ ہیں۔ پیشگی اجازت کے بغیر کوئی تحریر شائع نہیں کی جاسکتی۔

● ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی قرآن وحدیث پر مبنی تحریروں کے علاوہ کہانیوں کے کردار و واقعات فرضی ہیں۔ کسی اتفاقیہ مماثلت کی صورت میں ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا۔

● ماہنامہ آنکھ مچولی کو گرین گائیڈ اکیڈمی نے ضمیر الدین میموریل آرگنائزیشن کے زیرِ سرپرستی بچوں کی ذہنی اور علمی صلاحیتوں میں اضافے اور سیرت و کردار کی تعمیر کے لیے شائع کیا۔

جلد ۴ شمارہ ۵ نومبر ۱۹۸۹ء ربیع الثانی ۱۴۱۰ھ

ناشر : ظفر محمود شیخ طابع : زاہد علی مطبع : لاریب پرنٹنگ پریس، ایم اے جناح روڈ۔ کراچی
خط وکتابت کا پتہ : ماہنامہ آنکھ مچولی، گرین گائیڈ اکیڈمی، ۱۱۲۔ڈی، نورس روڈ، سائٹ کراچی

قیمت ۱۰ روپے ، ۷ درہم ، ۷ ریال
زرِسالانہ کے لیے خصوصی بچت اسکیم کا صفحہ دیکھیے

آنکھ مچولی کے ۱۲ شمارے
کتنے سستے کتنے پیارے

دسمبر ۱۹۸۹ء سے
قبل ممبر شپ حاصل کرنے
والوں کے لیئے مہمّاتی
کہانیوں کی خوبصورت
کتاب "حق اسکواڈ" کا
تحفہ بالکل مُفت

۵۰ روپے کی
خصوصی رعایت اور
تحفہ مفت

آنکھ مچولی کے بارہ شماروں کی قیمت
مع دو خاص شمارے اور رجسٹرڈ ڈاک خرچ
۲۱۰ روپے بنتی ہے، لیکن سالانہ ممبر شپ حاصل کرنے والوں کے لیے خصوصی
رعایت یعنی ۲۱۰، کے بجائے صرف **۱۵۰** روپے۔ اس طرح گویا
مالی منفعت بھی اور علمی فائدہ بھی

آنکھ مچولی بیرونِ مُلک منگوانے کے لئے زرِ سالانہ مُبلغ ۳۰۰/- روپے
رسالہ سال بھر تک منگوانے کے لئے دو طریقوں میں سے جسے مناسب اور احسن سمجھیں اختیار کریں۔
① زرِ سالانہ کی رقم دفتر کے پتے پر منی آرڈر کریں اور کوپن پُر کر کے ہمیں بھجوا دیں **یا**
② ۱۰ روپے کے ڈاک ٹکٹ اور صرف کوپن پُر کر کے ہمیں بھجوا دیں۔ ہم آپ کو پہلا رسالہ (وی پی) بھجوا دیں گے۔
آپ ۱۴۰ روپے کے عوض وی پی چھڑوالیں (کوپن صفحہ نمبر ۱۱۱ پر موجود ہے)

سالانہ ممبر شپ آنکھ مچولی ۱۱۲۔ ڈی سائٹ کراچی

حسنِ ترتیب

- ڈاکیا ڈاک لایا — ۱۱
- سب سے بڑا انسان — ۱۴
- درختوں کا سرکس سلمیٰ سلیم — ۱۸
- دھاڑیل نعیم بلوچ — ۲۱
- جلد بازی ایم شہزاد احمد — ۲۸
- اتفاق نظم شاہنواز فاروقی — ۳۰
- بی اماں محمد جاوید خالد — ۳۱
- وھیل کے کھیل محمد سلیم مغل — ۳۷
- ناکیں محمد ساجد — ۴۴
- انجانی مہم محمد نوید مرزا — ۴۵
- انوکھی شیرنی رعنا اقبال — ۵۱
- آنکھیں ہیں کہ... مہوش شکیل — ۵۹
- اب میں دیکھ سکتا ہوں سید خورشید عالم — ۶۱
- اچھی تقلید سید گلستان جعفری — ۶۵
- دُم نہ ہوتو؟ تسین فاروقی — ۷۵
- کھٹے میٹھے مذاق — ۸۱
- چھلکے نظم محمد جاوید خالد — ۸۵
- کیا ہم واقعی ایسے ہیں محمد خالد نون — ۸۶
- ماضی کا داغ عمران مشتاق — ۸۹
- اُلٹا پیس نظم عنایت علی خان — ۹۵
- مائیکروا ووَن محمد صالح ارشاد — ۹۶
- مادام تساؤ کے شہر میں سلمان غزالی — ۹۸
- چھوٹا راستہ شاہنواز فاروقی — ۱۰۷
- کوپن کا صفحہ — ۱۱۱
- معاہدہ طاہر مسعود — ۱۱۳
- بڑا پھنسا نظم وحید ظفر شیخ — ۱۱۸
- جُستجو شرط ہے اسامہ بن سلیم — ۱۱۹
- اُڑن کھٹولا ساجد سعید — ۱۲۳
- سائنس انکوائری سید ایاز محمود — ۱۲۷
- دنیا میرے آگے ترجمہ — ۱۳۳
- حرفوں کا گورکھ دھندا — ۱۳۷
- صحت یا چٹخارہ نیّر ابدالی — ۱۴۱
- گِنی چُنی معلومات سید عقیل عباس جعفری — ۱۴۴
- ننھی نگارشات — ۱۴۸
- سالگرہ کے ساتھی قلمی دوستی — ۱۶۰
- امّی ابو کا صفحہ ذہرہ بتول — ۱۶۳

تاریخ کے دریچے سے

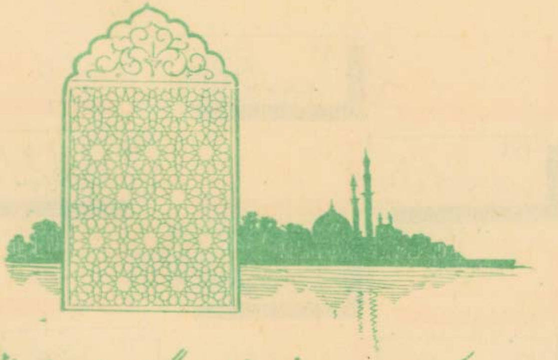

ایک عابدہ اور زاہدہ نے اپنے خدمت گار اور سعادت مند بیٹے سے پانی لانے کے لئے کہا اور خود بستر پر دراز ہو گئیں۔ بیٹے نے حکم کی تعمیل کی اور جلدی سے پیالہ دھو کر پانی بھرا اور ماں کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ مگر اس عرصے میں ماں کی آنکھ لگ چکی تھی۔ ماں کو سوتے سے اُٹھانا بھی اس نیک بخت بیٹے کو اچھا نہ لگا اور یہ بھی بھلا نہ لگا کہ وہ ماں کو پانی پلائے بغیر واپس چلا جائے۔ اُس نے یہی مناسب جانا کہ ماں کی آنکھ کھلنے کا انتظار کیا جائے سو اُس نے رات اسی انتظار میں کاٹ دی۔ صبح جب ماں کی آنکھ کھلی تو کیا دیکھتی ہیں کہ پانی کا پیالہ بیٹے کے ہاتھ میں ہے اور وہ مؤدب کھڑا ماں کی آنکھ کھلنے کا منتظر ہے۔ ماں نے سعادت مندی اور محبت کا یہ عالم دیکھ کر بے اختیار دونوں ہاتھ اُٹھا کر خدا کے حضور دُعا کی کہ "اے پروردگار میرے اس نیک بیٹے کو دو جہاں میں سرفراز کر اور اپنی محبت میں کامل ولی کر دے"

ماں کی دُعائیں عرشِ عظیم پر قبول ہوئیں اور اُن کے نیک بخت بیٹے کو دین و دنیا کی سعادت حاصل ہوئی۔ ہم اور آپ تاریخ کی اس روشن مثال انسان کو حضرت فقیہہ علی مخدومؒ کے نام سے جانتے ہیں۔ آپ اللہ تعالیٰ کے صاحبِ کرامات ولی ہو گزرے ہیں۔ آپ کی رحلت ۸۳۵ ہجری میں ہوئی۔

اداریہ

ماہِ رواں کی پہلی بات

بُری عادت صرف بُرے لوگوں میں نہیں ہوتی، اچھے لوگوں میں بھی ہو سکتی ہے۔ سگریٹ نوشی بھی ایک ایسی ہی بُری عادت ہے۔ جس کا شکار اکثر اچھے خاصے سمجھدار اور تعلیم یافتہ لوگ ہوتے ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ یہ لوگ، سگریٹ نوشی کے نقصانات سے خوب واقف ہوتے ہیں، مثلاً وہ جانتے ہیں کہ سگریٹ نوشی میں روپے پیسے کا نقصان ہے، صحت کا نقصان ہے اور یہ کہ صحت ہی کا نقصان کیا کم ہے اور یہ تو ذاتی نقصان ہوا لیکن قومی لحاظ سے دیکھئے تو ہمارے بزرگ اربوں روپے کے صرف سگریٹ پھونک ڈالتے ہیں۔ اس رقم کی بچت کر کے اسے کتنے مفید کاموں میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ سگریٹ نوشی سے جو بیماریاں پھیلتی ہیں اور اس سے علاج معالجے میں جو اخراجات اُٹھتے ہیں وہ الگ ہیں۔ اس معاملے کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ بزرگوں کی دیکھا دیکھی نوجوانوں میں سگریٹ نوشی کی وباء پھیلتی ہے اور بعض اوقات تو نہایت کم عمر بچوں میں، خاص طور پر محنت کش بچوں میں سگریٹ نوشی کا رجحان پایا گیا ہے۔

سگریٹ نوشی کے اس رجحان کی روک تھام کے لئے حکومت کی وزارتِ صحت کی جانب سے ٹیلی وژن اور اخبارات میں آئے دن اشتہارات چھپتے رہتے ہیں، سگریٹ کے ڈبّوں پر بھی "خبردار تمباکو نوشی صحت کے لئے مضر ہے" کے جملے لکھے نظر آتے ہیں۔ لیکن ذرا سوچئے کہ ان کا کیا اثر ہوتا ہے؟ کتنے لوگ ان اشتہارات کو پڑھ کر سگریٹ پینا بند کر دیتے ہیں۔ شاید ایک فیصد بھی نہیں۔

آنکھ مچولی کو بچّوں ہی کی نہیں اُن کے والدین اور سرپرستوں کی صحت بھی عزیز ہے۔ کیونکہ ان کی صحت و تندرستی میں ہی بچّوں کا تابناک مستقبل پوشیدہ ہے۔ اسی لئے آنکھ مچولی نے سگریٹ نوشی کے خلاف اپنی تحریک شروع کی ہے۔ اس تحریک کا مقصد یہ ہے کہ بچّوں کو اس بات کے لئے آمادہ کیا جائے کہ وہ اپنے بڑوں سے سگریٹ نوشی ترک کرائیں۔ بچّے انہیں بتائیں کہ اُن کی صحت صرف انہی کے لئے نہیں خود اُن کے اپنے جگر گوشوں کے لئے بھی کتنی ضروری ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ باشعور لوگوں پر بچّوں کی اس تحریک کا مفید اثر مرتب ہوگا۔ اس لئے کہ سگریٹ نوشی کے عادی حضرات بھی اس بات کو پسند نہیں کریں گے کہ ان کے بچّے بڑے ہو کر سگریٹ کی عادت اپنائیں۔ ظاہر ہے سگریٹ نوشی کے نقصانات سے ان سے زیادہ کون واقف ہوگا۔

ہم اس شمارے کے ساتھ بچّوں کو سگریٹ نوشی کے خلاف ایک اسٹیکر دے رہے ہیں۔ تاکہ وہ اسے کسی مناسب سی جگہ پر چسپاں کر دیں۔ ساتھ ہی بچّوں سے اپیل کرتے ہیں کہ اگر ان کے والد، سرپرست، بڑے بھائی یا عزیز و اقارب میں جو کوئی بھی سگریٹ نوش ہو، بچّے اُن سے ادب و تہذیب سے سگریٹ چھوڑ دینے کی درخواست کریں، صرف ایک بار نہیں بار بار، دلیل کے ساتھ، معقولیت کے ساتھ، اپنی محبّت کا حوالہ دے کر اور ہر اس طریقے سے جس سے اُن کے دل پر اثر ہو اور سگریٹ سے اپنا پیچھا چھڑا سکیں۔ مجھے امید ہے اس تحریک کے نتیجے میں اگر کوئی کامیابی ہوتی ہے تو یہ پاکستانی بچّوں کا عظیم کارنامہ ہوگا جو بڑوں کے لئے فائدہ مند بھی ہوگا اور لائقِ تقلید مثال بھی۔

آپ کا دوست

ظفر محمود شیخ

حصولِ علم کا سامان

آنکھ مچولی اسکالرشپ کا اعلان

بچوں کے رسائل کی تاریخ میں ایک روشن اور قابلِ تقلید باب کا اضافہ وعدے کے مطابق آنکھ مچولی کے پانچ ذہین اور خوش قسمت قارئین کے نام ایک ایک ہزار کے پانچ اسکالرشپ کے نتائج کا اعلان ۔

آنکھ مچولی اسکالرشپ کے لئے موصول ہونے والے ہزاروں کوپنوں میں سے قرعہ اندازی کے ذریعے
پانچ خوش نصیبوں کا انتخاب ملک کے ممتاز و قابلِ فخر سائنس دان ڈاکٹر سلیم الزّماں صدیقی نے کیا

اسکالرشپ حاصل کرنے والے خوش نصیب ساتھی

- ارم فرقان ——— 1/4 5 B ۔ پاپوش نگر ۔ ناظم آباد ۔ کراچی 18
- وسیم احمد ——— 5/886 ۔ لیاقت آباد ۔ کراچی 19
- محمّد امین ——— 282 / B.VI ۔ محمّدی کالونی ڈھوک علی اکبر راولپنڈی
- محمّد عدنان ——— مکان نمبر 145 ۔ گلی نمبر 3 غازی چوک ۔ بشیر کالونی سرگودھا 40100
- ایم صادق شاھین ——— صادق جنرل اسٹور ۔ مین بازار پنڈ دادنخان

تمام خوش نصیبوں کو آنکھ مچولی کی جانب سے دلی مبارک باد ۔ آپ کی اسکالرشپ انشاء اللہ جلد روانہ کردی جائے گی ۔ خوش نصیب طلباء اپنے تعلیمی اداروں سے اپنے طالب علم ہونے کا صداقت نامہ مع مکمّل پتے کے ارسال فرمائیں۔

نئے اور تعمیری کاموں کی عادت آنکھ مچولی کی روایت

تعلیمی اسکالرشپ ایک صحت مند روایت ہے جو ماہنامہ آنکھ مچولی نے قائم کی ہے ۔ مجھے امید ہے کہ خوش قسمت طلباء اسکالرشپ کی صورت میں ملنے والی رقم کو حصولِ علم کے لئے خرچ کریں گے اور علم سے لگاؤ کی بدولت زندگی میں بڑا انعام حاصل کریں گے ۔

ڈاکٹر سلیم الزّماں صدّیقی

محمد نواز چوھدری، میرپور، آزاد کشمیر :۔ رسالے کی قیمت اچانک چھ روپے سے دس روپے ہوگئی۔ حیرت ہوئی۔ حالانکہ رسالے کے صفحات میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہوا۔ اگر آپ زیادہ سے زیادہ پیسے کمانا چاہتے ہیں تو میرا حقیر سا مشورہ ہے کہ آپ انعامی مقابلوں کی تعداد میں اضافہ کر دیں۔ میرا دعویٰ ہے کہ بازار میں سب سے زیادہ فروخت ہونے والا رسالہ صرف آنکھ مچولی ہوگا۔

● میرے دوست! رسالے کی قیمت اچانک نہیں بڑھی۔ ہم کئی مہینے سے اپنی مجبوریاں بیان کر رہے تھے۔ آپ کا یہ کہنا بھی درست نہیں کہ رسالے کے صفحات میں اضافہ نہیں ہوا۔ پورے ۳۲ صفحات بڑھے ہیں اور اب مزید ۸ صفحات کا اضافہ کیا جا رہا ہے۔ ہمیں اگر پیسہ کمانا ہوتا تو کوئی اور کام کرتے۔ مثلاً کباب تکّے کی دکان کھول لیتے اِس کاروبار میں رسالہ نکالنے سے زیادہ منافع ہوتا ہے۔

ف، ی اور ظ، ع، کراچی :۔ آپ کے علم میں کوئی ایسا ادارہ ہے جو غریب طلبا کی مدد کر سکے۔ مدد سے ہماری مراد ہے۔ کورس کی کتابیں وغیرہ کوئی فراہم کر دے۔ ہم دو بھائی بہن طالب علم ہیں اور کتابیں مہنگی ہوگئی ہیں۔

● ہم آپ کا پتہ شائع کئے دیتے ہیں اگر کسی ساتھی کے پاس آپ کے کلاس کی کتابیں ہوں تو وہ آپ کو بھیج سکتا ہے۔ کیونکہ ہیں لوگ دنیا جہاں میں اچھے آتے ہیں جو کام دوسروں کے۔ پتہ ہے: الف - ۹۲ الفلاح ہاؤسنگ سوسائٹی پروجیکٹ سوسائٹی ملیر ہالٹ کراچی۔

بنتِ سعدیہ، عزیز آباد - کراچی :۔ آپ نے کچھ عرصہ پہلے اداریے میں کہا تھا کہ کاغذ کی قیمت بڑھ جانے کی وجہ سے ہمیں رسالے کی قیمت بڑھانی پڑے گی۔ اور یہ وقت آپ لوگوں کی آنکھ مچولی سے محبت کا امتحان ہوگا۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ کاغذ کی

ڈاکیا ڈاک لایا

قیمت بڑھنے میں بچّوں کا کیا قصور ہے۔ اگر آپ مہنگائی کے ہاتھوں مجبور ہیں تو ہم بھی اس کا شکار ہیں۔ ہمارے والدین کوئی روپے بنانے کی مشین نہیں ہیں۔ ہمیں اس رسالے سے بے تحاشہ محبت ہے لیکن ہمیں اپنے والدین کی کمائی کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے۔ میری گزارش ہے کہ اس رسالے کی قیمت زیادہ نہیں تو تھوڑی سی ضرور کم کر دیں۔

● بہن بلبلی! آپ کی ناراضگی سر آنکھوں پر لیکن آپ ایک لمحے کے لئے سوچئے کہ آج کل دس روپے کی کیا حیثیت ہے۔ لوگ پچیس پچاس روپے کی آئسکریم کھا جاتے ہیں، ٹھنڈے بوتلیں پی لیتے ہیں اور نہ جانے کن کن فضول خرچیوں میں اُڑا دیتے ہیں۔ لیکن اگر رسالے کی قیمت بڑھا دی جائے تو قیامت ٹوٹ پڑتی ہے۔ حالانکہ ہم نے رسالے کی قیمت بڑھائی ہے تو رسالے کا معیار بھی بڑھایا ہے۔ انعامات۔ وظائف۔ مقابلے، صفحات میں اضافہ اور اس طرح کی بے شمار چیزیں۔ اگر آپ ان سب باتوں پر غور کریں گی تو معلوم ہوگا کہ دس روپے کی عوض جو کچھ ذہنی غذا آپ کو دی جا رہی ہے وہ دس روپے سے بہت زیادہ ہے۔

ثناء اللہ۔ میر پور خاص ،، آپ آنکھ مچولی کے ہر شمارے میں کوئی تصویر شائع کیا کیجیے۔ جس کا عنوان قارئین لکھ کر بھیجیں جس قاری کا سب سے اچھا عنوان ہو وہ انعام کا حق دار قرار پائے۔

● اس طرح کے مقابلے ہم نے ماضی میں کرائے ہیں۔ پھر بھی آپ کی تجویز نوٹ کرلی گئی ہے۔ اب ایک کام کیجیے کہ فنافٹ ہمیں کوئی بہت دلچسپ اور اچھی سی تصویر بھیج دیجیے۔ اگر پسند آئی تو اس پر مقابلہ کرا دیا جائے گا۔ کہئے کیسا؟

دکیہ امبرین شکیل احمد (؟) انکل! آپ میری ہر تحریر کے ساتھ اتنا بُرا سلوک کیوں کرتے ہیں۔ میں آنکھ مچولی کی تین سال سے قاری ہوں۔ بے شک یہ اپنی طرز کا واحد رسالہ ہے۔ اس کی خصوصیت اس کے رنگین صفحات ہیں۔ لیکن اب نہ جانے کیوں اُس کے رنگین صفحات اور سرورق کے کاغذ کا معیار گر گیا ہے۔ اسے سنوارنے کی کوشش کیجیے۔ رسالے میں نئے مقابلے پسند آئے میری تجویز ہے کہ آپ سب سے بہتر کہانی بھیجنے والے کو انعام دیجیے۔ اس طرح بچّے مزید محنت سے خوب اچھی اچھی کہانیاں بھیجا کریں گے۔

● میرے خدا... اتنا بڑا الزام۔ اچھی تحریروں کے ساتھ بُرا سلوک بھلا ہم کیسے کر سکتے ہیں۔ سرورق اور رنگین صفحات کی دوسرے ساتھی تو تعریفیں کرتے ہیں۔ ہم کوشش کریں گے کہ آپ کی توقعات پر بھی پورے اُتریں۔ بہترین کہانی پر انعام کی تجویز اچھی ہے... کیا آپ نے بہترین کہانی لکھ لی ہے؟

مظلمی عقیل فاروقی، سکھر:۔ میری ایک تجویز ہے کہ آنکھ مچولی کے قلمکاروں کو معاوضہ دیا جاتا ہے تو کیوں نہ ایک ایسی یونین کی بنیاد ڈالی جائے جس میں ایسے قلمکاروں کو شامل کیا جائے جو اپنے شوق کو پورا کرنے کے لئے آنکھ مچولی اور اپنے قارئین ساتھیوں کے لئے بلا معاوضہ لکھیں اور تحریکِ فروغِ علم میں حصہ لیں۔

● بھئی آپ کی تجویز تو ہمارے فائدے میں جاتی ہے کہ ہمیں مفت لکھنے والے ملیں گے۔ لیکن یہ بتائیے کہ یہ ستم آپ صرف لکھنے والوں پر کیوں توڑ رہے ہیں۔ آپ ایسے کاغذ بیچنے والوں کی یونینیں کیوں نہیں بناتے۔ جو بچّوں کے رسالوں کو رعایتی قیمت پر کاغذ فراہم کیا کریں۔ تاکہ ہم بچّوں کو کم قیمت پر رسالے بیچ سکیں۔

آصف فاروق۔ لاھور:۔ رفعت ہمایوں کے مضمون "جب ہم کھو گئے تھے" میں آغاز "تم" سے کیا گیا ہے۔ اور اس تحریر

میں قارئین کو بارہا "تم" سے مخاطب کیا گیا ہے۔ آپ کے خیال میں یہ رسالہ صرف بچے ہی پڑھتے ہیں کیا؟ میرا خیال ہے کہ ہر عمر کے لوگ بشمول بزرگ پڑھتے ہوں گے تو کیا یہ ضروری نہ تھا کہ "تم" کے بجائے "آپ" کا لفظ استعمال کیا جاتا۔

● آصف صاحب! آپ نے اعتراض نیک نیتی سے کیا ہے، لیکن آپ یہ بھول گئے کہ یہ رسالہ بچوں کا ہے اور مضمون نگار بہر حال کئی بچوں کی ماں ہیں لہٰذا وہ تو بچوں کو پیار سے ہی مخاطب کریں گی اور پیار اور بے تکلفی میں بڑے "بچوں" کو تم سے ہی مخاطب کرتے ہیں۔ رہے وہ بزرگ جو ہمارا رسالہ پڑھتے ہیں تو وہ بھی اسے بچوں ہی کا رسالہ سمجھ کر پڑھتے ہیں اور اس میں بدتمیزی کا کوئی پہلو نہیں ہے۔

معظم اقبال، جھجوال، تحصیل سمندری۔ آپ سے مجھے شکایت ہے کہ ۱۹۸۸ء میں پرائڈ آف پرفارمنس کے سلسلے میں تصدیق نامہ بھیجا تھا۔ کیا آپ صرف اپنے دوستوں ہی کو تحفے دیتے ہیں ...؟ اس دفعہ میں نے جماعت ششم میں ۴۷، نمبر حاصل کرکے پورے اسکول میں فرسٹ ڈویژن حاصل کی ہے۔

● بھئی آپ کا تصدیق نامہ ہمیں نہیں ملا۔ لیکن چونکہ آپ نے پورے اسکول میں سب سے امتیازی نمبر لئے ہیں اس خوشی میں آپ کو ہم پرائڈ آف پرفارمنس ضرور دینا چاہیں گے۔ البتہ آپ کو تصدیق نامہ ایک بار پھر بھیجنے کی تکلیف کرنی پڑے گی۔

فرحین شازیہ، نارتھ ناظم آباد، کراچی۔ اکتوبر میں "اتو کا خطاب" (راجی سے) کی اشاعت بالکل پسند نہیں آئی۔ کیونکہ اس نظم کے ذریعے آپ نے بچوں کو کس قسم کی تعلیم دینے کی کوشش کی ہے۔ اس نظم سے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے آقا کسی غلام سے مخاطب ہو۔ اس کے علاوہ نظم میں زبان بھی خاصی نامناسب استعمال کی گئی ہے۔

● یہ نظم اردو کے مشہور مزاحیہ شاعر راجہ مہدی علی خان کی ہے۔ مزاحیہ شاعری کو اگر سنجیدگی بلکہ رنجیدگی سے پڑھا جائے تو اس میں سو کیڑے نکالے جا سکتے ہیں، لیکن اگر اس قسم کی شاعری کو لطف حاصل کرنے کے لئے پڑھا جائے تو اس میں کوئی برائی نظر نہیں آئے گی۔ اگر یہ نظم واقعی نامناسب ہوتی تو اب تک بے شمار خطوط آ چکے ہوتے۔ کیونکہ ہمارے پڑھنے والے بہت باہوش اور سمجھدار ہیں۔

مقابلۂ خطاطی

اللہ خود حسین ہے اور حسین چیزوں کو پسند کرتا ہے

آیئے اللہ تعالیٰ کے ناموں کو حسین سے حسین تر انداز سے لکھیں۔ آپ اللہ تعالیٰ کے ۹۹ اسمائے حسنیٰ میں سے کوئی بھی ایک نام انتہائی دلکش اور حسین انداز سے لکھیں اور ۱۰، نومبر سے قبل ہمیں بھجوا دیں۔ خطاطی کے تین بہترین شہ پاروں کو انعامات دیا جائے گا اور منتخب نمونے آپ کے نام کے ساتھ شائع کئے جائیں گے ... خطاطی کے لئے کالی سیاہی استعمال کریں۔ اسم مبارک لکھنے کے لئے کوئی بھی خط یا انداز اختیار کیا جا سکتا ہے۔

مقابلۂ خطاطی۔ آنکھ مچولی۔ ۱۱۲۔ ڈی۔ سائیٹ کراچی

سب سے بڑا انسانؐ

ادارہ آنکھ مچولی کی شائع کردہ صدارتی ایوارڈ یافتہ کتاب "سب سے بڑا انسانؐ" کے چند اوراق
رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کے چند گوشوں سے انتخاب

سید نظر زیدی

حضرت رسول اللہ کا بچپن

حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے دادا حضرت عبدالمطلب کو آپؐ کے دنیا میں تشریف لانے کی خبر ملی تو وہ آپؐ کو کعبہ شریف میں لے گئے اور وہاں آپؐ کے لئے دعائیں مانگیں۔

جب آپ کی عمر سات دن کی ہوئی تو حضرت عبدالمطلب نے آپؐ کا عقیقہ کیا، یعنی جانور ذبح کر کے برادری کے لوگوں کی دعوت کی اور آپؐ کے سر کے بال اتروائے۔

اس زمانے میں قریش اپنے بچوں کو گاؤں میں رہنے والی عورتوں کے ساتھ بھیج دیتے تھے جو انہیں دودھ پلاتی تھیں اور گاؤں کے صاف ستھرے ماحول میں پرورش کرتی تھیں۔

جب ہمارے حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم دنیا میں تشریف لائے دیہات کی کچھ عورتیں اس لئے مکہ آئی تھیں کہ قریش کے بچوں کو دودھ پلانے کے لئے اپنے ساتھ لے جائیں۔ ان عورتوں میں

قبیلہ بنو سعد کی ایک خوش قسمت خاتون حضرت حلیمہ سعدیہ بنت ابی زویب بھی تھیں۔ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو یہی خاتون اپنے ساتھ لے گئیں اور یوں انہیں یہ عزت حاصل ہوئی کہ انہوں نے اس مبارک بچے کو دودھ پلایا جو دنیا کا سب سے بڑا انسان اور سارے نبیوں کا سردار بنا۔

حضرت حلیمہ کے خاوند کا نام الحارث تھا اور ان کے تین بچے تھے۔ ایک لڑکا اور دو لڑکیاں۔ لڑکے کا نام عبداللہ اور لڑکیوں میں سے ایک کا نام انیسہ اور دوسری کا شیبہ تھا۔

حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو دودھ پلانے کے سلسلے میں یہ روایت بھی ہے کہ آپؐ کو سب سے پہلے آپؐ کی والدہ صاحبہ حضرت آمنہ نے دودھ پلایا۔ ان کے بعد آپؐ کے چچا ابولہب کی کنیز حضرت ثوبیہ نے دودھ پلایا اور ان کے بعد حضرت حلیمہ اپنے ساتھ لے گئیں۔

حضرت حلیمہ سعدیہ کے ساتھ جانے سے پہلے جس خاتون نے آپؐ کو گود کھلایا تھا وہ آپؐ کے والد صاحب کی کنیز حضرت اُمّ ایمن تھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی برکت سے ان دونوں کنیزوں کو آزاد کر دیا گیا۔

حلیمہ کے گھر برکتوں کی بارش

دیہات کی جو عورتیں قریش کے بچوں کو دودھ پلانے کے لئے لینے مکہ آئی تھیں ان میں حضرت حلیمہ سب سے غریب تھیں۔ ان کی سواری کی اونٹنی بالکل کمزور اور دبلی پتلی تھی، لیکن جب انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو دودھ پلانے کے لئے لیا اور اپنے گھر کی طرف چلیں، تو یہ برکت ظاہر ہوئی کہ ان کی وہی کمزور اونٹنی قافلے کے سب جانوروں سے زیادہ تیز چلنے لگی۔

اس کے بعد دوسری برکت یہ ظاہر ہوئی کہ حضرت حلیمہ کی بکریوں نے پہلے سے زیادہ دودھ دینا شروع کر دیا۔ اسی طرح دوسری چیزوں میں برکت نظر آنے لگی اور کچھ ہی دنوں میں حضرت حلیمہ خوش حال ہو گئیں۔

حضرت حلیمہ سعدیہ نے حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو دو برس دودھ پلایا۔ بچوا ،کو اتنے ہی دن دودھ پلایا جاتا تھا۔ جب آپؐ دو برس کے ہو گئے تو حضرت حلیمہ آپ کو مکہ لے آئیں، لیکن حضرت آمنہ سے کہا۔ آپ اپنے بیٹے کو کچھ دن اور میرے ساتھ رہنے دیں۔

حضرت آمنہ نے یہ بات مان لی اور حضرت حلیمہ آپؐ کو اپنے ساتھ پھر اپنے گاؤں لے گئیں۔ آپؐ دو برس دوران کے پاس رہے۔ چار برس کی عمر ہوئی تو حضرت حلیمہ نے آپؐ کو آپؐ کی والدہ صاحبہ کے پاس مکہ پہنچا دیا۔

ان چار برسوں میں جو ہمارے حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے حضرت حلیمہ سعدیہ کے گھر گزارے حضرت حلیمہ چھ چھ مہینے بعد آپ کو آپ کی والدہ صاحبہ سے ملانے کے لئے مکہ لاتی رہیں۔

حضرت حلیمہ کے گھر ہمارے حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم بہت خوش رہے۔ آپ کے دودھ شریک بھائی اور بہنیں، یعنی حضرت حلیمہ کے بچے اپنی بکریاں چرانے کے لئے جنگل لے جایا کرتے تھے اور ہمارے حضور بھی ان کے ساتھ چلے جایا کرتے تھے اور ان کے ساتھ کھیلتے رہتے تھے۔

اس زمانے میں ایک بہت عجیب واقعہ بھی ہوا۔ ایک دن ہمارے حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اپنے بھائی بہنوں کے ساتھ جنگل میں تھے کہ دو فرشتے انسانوں کی شکل میں ظاہر ہوئے اور انہوں نے آپ کا سینہ چاک کر کے آپ کا دل باہر نکالا۔ کالے رنگ کی کوئی چیز الگ کی اور پھر سینے میں رکھ کر زخم سی دیا۔

آپ کے دودھ شریک بھائی اور بہنیں یہ دیکھ کر بہت ڈرے۔ بھاگے بھاگے اپنی ماں کے پاس آئے اور ان سے کہا۔ "ہمارے قریشی بھائی کو دو آدمیوں نے مار ڈالا۔"

یہ بات سن کر حضرت حلیمہ جنگل میں گئیں، تو وہاں آپ کو بالکل ٹھیک حالت میں دیکھا۔ یہ دراصل پہلا معجزہ تھا جو آپ کی زندگی میں ظاہر ہوا۔

معجزہ ایسے واقعے کو کہتے ہیں جس میں انسان کی کوشش اور ارادے کو بالکل دخل نہ ہو بلکہ وہ خدائی طاقتوں کی وجہ سے ظاہر ہوا ہو اور ایسا عجیب ہو کہ بڑے سے بڑا عقلمند آدمی بھی یہ نہ سمجھ سکے کہ یہ کس طرح ہو گیا۔

اللہ پاک نے اپنی خاص مہربانی سے اپنے نبیوں اور رسولوں کو معجزے دیئے تھے۔ مثال کے طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ معجزہ دیا تھا کہ وہ اپنی لاٹھی زمین پر ڈالتے تھے تو وہ سانپ بن جاتی تھی اور اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں ڈال کر باہر نکالتے تھے، تو وہ چمکنے لگتا تھا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ پاک نے یہ معجزہ دیا تھا کہ آپ پیدائشی اندھے کی آنکھوں پر ہاتھ پھیرتے تھے تو اس کی آنکھیں بالکل ٹھیک ہو جاتی تھیں اور کوڑھی کے بدن پر ہاتھ پھیرتے تھے تو وہ تندرست ہو جاتا تھا۔

ہمارے حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو اللہ پاک نے سب نبیوں سے زیادہ معجزے دیئے تھے۔ ان میں پہلا معجزہ یہ تھا کہ فرشتوں نے آپ کا سینہ چیر کر دل باہر نکالا اور اس سے کالے رنگ کی کوئی چیز دور کر کے پھر سینے میں رکھ دیا اور سینے کا زخم اس طرح ٹھیک ہو گیا جیسے تھا ہی نہ۔

بزرگوں نے اس سلسلے میں یہ بھی لکھا ہے کہ آپ کے دل سے کالے رنگ کی کوئی چیز دور کر کے اسے نور

سے بھر دیا گیا تھا۔ ایسا کرنے سے وہ ساری کمزوریاں آپؐ سے دور ہو گئیں جو عام انسانوں میں ہوتی ہیں اور ایسی سب، اچھائیاں مل گئیں کہ کسی اور کو نہیں ملیں۔

حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی پاک زندگی سے پہلا سبق یہی ملتا ہے کہ اچھی عادتیں اختیار کرنے اور اپنی زندگی کو صاف رکھنے کے لئے مال و دولت اور پریشانیوں سے پاک حالت کی اتنی ضرورت نہیں جتنی اپنے آپ کو اچھا بنانے کے پکے ارادے کی ہے۔

جتنی پریشانیاں ہمارے حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو اٹھانی پڑیں اور کسی کو کم ہی اٹھانی پڑی ہوں گی، لیکن ان کا آپؐ کی عادتوں پر ذرا بھی اثر نہ پڑا۔ آپؐ نے ایسی ایک عادت بھی اختیار نہ کی جو کسی کو بری لگتی، ایسی پاک صاف زندگی گزاری کہ دشمنوں کو بھی تعریف کرنی پڑی۔

ہم اپنی دنیا میں جس قدر خوبصورتی اور پاکیزگی دیکھتے ہیں وہ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے صدقے ہی حاصل ہوئی ہے۔

نام بھی انعام بھی

مقابلۂ تحریر میں "کہانیوں" کے عنوان سے ہمارے بہت سے قارئین نے حصّہ لیا۔ یوں تو ہر تحریر سوائے چند ایک کے جاندار تھی۔ مگر ہم نے تین تحریروں کا انتخاب کیا ہے جو دیگر نگارشات کے مقابلے میں زیادہ بہتر تھیں۔

۱۔ "میلے آنسو" سیدہ ناصری اعجاز۔ نیو کراچی۔ کراچی۔ پہلا انعام

۲۔ "پُراسرار قتل" اعجاز احمد۔ ڈنگہ۔ گجرات۔ دوسرا انعام

۳۔ "بدگمان" بن یامین۔ مقام نامعلوم۔ تیسرا انعام

ادارہ آنکھ مچولی انعام یافتگان کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہے۔

ہم اپنے انعام یافتگان سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اپنے شناختی کارڈ کی نقل ارسال کر دیں اور ساتھ ہی ایک حلف نامہ بھی۔ جس میں اس بات کی یقین دہانی کرائی جائے کہ ان کی کہانی (الف) طبعزاد ہے (ب) اس سے پہلے کبھی شائع نہیں ہوئی۔

نوٹ:۔ انعامی مقابلے کے سلسلے میں موصول ہونے والی دیگر قابلِ اشاعت کہانیوں کی فہرست اگلے مہینے شائع کر دی جائے گی۔

سلمیٰ سلیم

درختوں کا سرکس

لیزا جیسے ہی باغ کے اندر داخل ہوئی اُس کا منہ کُھلا کا کُھلا رہ گیا۔ اُس کے سامنے ایک عجیب وغریب درخت موجود تھا۔ انسان کے دل کی شکل والا درخت۔

درخت کو دیکھتے ہی لیزا کا ہاتھ بے ساختہ اپنے دل کی طرف اُٹھ گیا۔ پھر وہ دھڑکتے دل کے ساتھ اُس درخت کے قریب گئی اور اُسے بے یقینی کے ساتھ دیکھنے لگی۔ اس کے بعد لیزا نے باغ میں جدھر بھی نظر دوڑائی اُسے عجیب وغریب شکلوں والے بہت سے درخت نظر آئے۔ سیڑھی کی شکل والا درخت، انسانی جسم کی شکل والا درخت، روزنوں یا جھروکوں والا درخت۔

یہ باغ جس کا نام "درختوں کا سرکس" ہے امریکی ریاست کیلی فورنیا میں موجود ہے۔ اس عجیب وغریب کی تخلیق کا خیال سویڈن کے ایک باشندے ایکسل کو آج سے چالیس سال قبل آیا تھا۔ ایکسل اُس زمانے میں سویڈن سے امریکہ میں آکر نیا نیا آباد ہُوا تھا۔ اُس وقت یورپ میں پیڑوں کو اس شکل میں اُگانے کا عمل بہت مقبول تھا۔ البتہ یہ آرٹ اب وہاں تقریباً ختم ہوچکا ہے۔

اس طرح درخت اُگانے کے عمل کو Pleaching کہتے ہیں۔ یہ لفظ فرانسیسی کے ایک لفظ سے نکلا ہے جس کا مفہوم بُننا ہے اس عمل میں پودوں کی شاخوں کو ابتداً ہی میں مرضی کے مطابق مختلف شکلوں میں موڑ کر ایک دوسرے کے ساتھ کپڑے وغیرہ کی مدد سے باندھ دیا جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ یہ شاخیں آپس میں جُڑ جاتی ہیں اور درخت فطری انداز میں کسی ایک شکل میں بڑھنے لگتا ہے۔

برابر کے صفحے پر اس باغ کے کچھ پیڑوں کی تصاویر موجود ہیں۔ ایک درخت روزنوں یا جھروکوں والا درخت ہے۔ جس کے جھروکوں سے لیزا اور اُس کے دو چھوٹے بھائی جھانک رہے ہیں۔ دوسرا درخت انسانی جسم سے مشابہت رکھتا ہے جبکہ تیسرا درخت جو آئندہ چل کر سیڑھی کی شکل اختیار کرے گا اپنے ابتدائی مرحلے میں دکھایا گیا ہے۔

اس باغ کے خالق ایکسل کا کئی برس ہوئے انتقال ہوچکا ہے۔ یہ باغ اب عام طور پر بند پڑا رہتا ہے۔ تاہم اس باغ سے محبّت کرنے والے کئی افراد کوشش کررہے ہیں کہ اس نادر باغ کو ہمیشہ کے لئے محفوظ کرکے عام افراد کے لئے کھول دیا جائے۔

ہم نے یہ محاورہ سنا تھا کہ "آپ کو آم کھانے سے مطلب ہونا چاہیئے پیڑ گننے سے نہیں"۔ مگر ہم نے جب سے اس حیرت انگیز باغ کے بارے میں پڑھا ہے ہمارا دل چاہ رہا ہے کہ اس محاورے کو بدل کر یوں کردیں: "آپ کو پیڑ دیکھنے اور گننے سے مطلب ہونا چاہیئے، پھل کھانے سے نہیں"۔ بھلا اتنے خوبصورت باغ کو دیکھ کر کون بدذوق ہوگا جو کھانے پینے کی باتوں کو یاد کرے۔ اب انسان اتنا بھی نیت خراب اور پیٹو نہیں ہوتا۔ کم از کم بچے۔ یعنی آپ! کیوں جی!

سلمی سلیم

زیتون کاسرکش

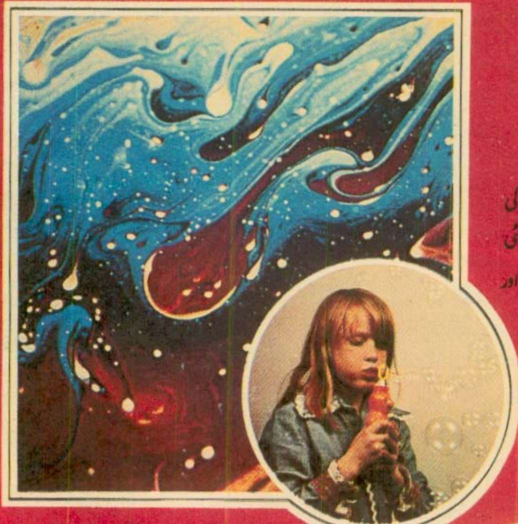

ہر بُلبلے کی اپنی الگ کائنات ہے

بظاہر بے رنگ نظر آنے والے بلبلے کی
تصویر جب انتہائی قریب سے اُتاری گئی
تو اس میں پوشیدہ رنگوں کی بہار اور
تجریدی دری کا ایک خوبصورت
نمونہ سامنے آ گیا

یہ سب کچھ نہیں ہے — تو پھر اور کیا ہے؟

۱۔ مگرمچھ کے منہ میں کاغذ — ؟

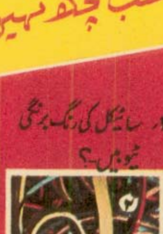

۲۔ سائیکل کی رنگ برنگی ٹیوبیں — ؟

۳۔ کوئی ڈرل مشین — ؟

۴۔ افریقی قبائل کی جھونپڑیاں — ؟

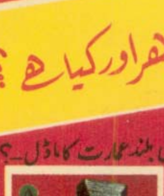

۵۔ کسی بلند عمارت کا ماڈل — ؟

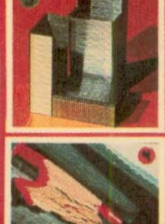

۶۔ کسی مشین میں پھنسی ہوئی پنسل — ؟

۷۔ ______ ؟

سلسلے وار ناول
قسط نمبر ۳

ڈاڑیل

"ڈھاڑیل"
بہ معنی
"ڈاکو"

نعیم بلوچ

اٹھارہ سالہ جانو کو اپنی بیمار ماں کے علاج کے لئے وڈیرے سے رقم نہ مل سکی۔ گوٹھ کے ایک ہندو بیوپاری رام چند نے اُس کو ماں کے علاج کے لئے رقم بھی دی اور اُسے ملازمت دلانے کے لئے اپنی اوطاق پر بُلایا جانو جب وہاں پہنچا تو اُس نے تین افراد اور اپنے ہم عمر لڑکے منظور کو پہلے سے موجود پایا۔ تھوڑی دیر بعد جانو اور منظور کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر ایک جیپ میں بٹھا دیا گیا۔ اس کے بعد جیپ کسی نا معلوم جگہ کی طرف روانہ ہوگئی۔ اُنھیں اندازہ ہوچکا تھا کہ وہ ڈاکوؤں کے کسی گروہ میں شامل ہو چکے ہیں۔ ایک طویل سفر کے بعد وہ ایک پہاڑی غار میں پہنچا دیئے گئے۔ یہاں اُنھیں ڈکیتی کے لئے تیار ہونا پڑا۔ چند روز بعد اُنھوں نے رات کے تین بجے مرکزی شاہراہ پر مسافروں سے بھری ہوئی ایک بس کو رکاوٹیں کھڑی کر کے روک لیا۔ بس میں موجود پولیس کے دو مسلح سپاہی اور مسافر چونک پڑے۔ مگر وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔

ڈاکوؤں نے بس کے تمام مسافروں کا اسباب لوٹ لیا اور ایک بوڑھے ہاری کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ جانو کو مسافروں سے ہمدردی اور ڈاکوؤں سے نفرت ہونے لگی تھی۔ وہ اپنے آپ کو ڈاکو نہیں سمجھ رہا تھا۔ دوسری طرف رام چند نے اردگرد کے علاقے میں رہنے والوں کو دعوت پر بُلایا اور ملک کے خلاف پروپیگنڈا شروع کیا کہ جو حکمران بھی آتا ہے وہ سندھیوں کو مارتا ہے۔ اس کے بعد "رام چند۔ زندہ باد" اور "سندھو دیش۔ زندہ باد" کے نعرے بھی لگے۔ دعوت کے بعد رام چند سردار قادر خان کو ایک خفیہ کمرے میں لے گیا جہاں بے شمار اسلحہ موجود تھا۔ رام چند نے قادر خان کو کہا کہ وہ ہر اُس آدمی کو اغوا کرے یا گولی مار دے جو فوج کو کسی بھی ڈاکو کے بارے میں کچھ بتائے۔ پھر اُس نے قادر خان کو کہا کہ وہ مشہور پاکستان دوست لیڈر عبدالحق کو ہر قیمت پر اغوا کرلے۔ اب آپ آگے پڑھیے۔

"نہیں چاہیے مجھے یہ روپے۔ لوگوں سے چھینے ہوئے روپے، میں کیوں لوں؟" جانو کی ماں غصے سے پھٹ پڑیں، جب اُس نے اپنے حصے کے روپے انہیں دینا چاہے۔

"کسی کی ماں نے یہ اعتراض نہیں کیا۔ سب فخر سے کہتی ہیں کہ میرا بیٹا ڈاکو ہے۔ اپنی طاقت سے اپنی روزی کماتا ہے" جانو نے حیرانی سے کہا۔

"کسی ماں کو لوٹ کی کمائی میں اپنے خاوند کے خون کی بُو نہیں آئی نا۔ یہ روپے نہیں ہیں جانو، یہ تمہارے باپ کے جسم کی بوٹیاں ہیں" ماں کی آنکھیں ساون بھادوں کے بادلوں کی طرح برسنے لگیں۔

"تمہیں معلوم ہے نا جانو کہ ابّو کو اس لئے گولی ماری گئی تھی کہ انھوں نے ڈاکوؤں کی مدد کرنے سے انکار کر دیا تھا"

"مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ پھر بھی پولیس نے انہیں ڈاکوؤں کا ساتھی کہا تھا... مجھے اس بات کا بھی علم ہے کہ ساری زندگی وڈیرے کی خدمت کرنے کے باوجود، ان کے پاس دو وقت کے کھانے کے علاوہ ایک پیسہ بھی نہیں ہوتا تھا اور میں یہ بھی جانتا تھا کہ اگر رام چند ہماری مدد نہ کرتا تو ہماری ماں مرجاتی۔ وہی رام چند جس کی تم ماں بیٹی تعریف کیا کرتی ہو، اس نے مجھے قادر خان کے حوالے کیا تھا۔ اور مجھے تمہاری قسم ہے ماں۔ میں اپنے باپ کے خون کا بدلہ لے کر رہوں گا" اپنی بڑی بہن کی بات کاٹ کر جانو نے ایک لمبی تقریر کر ڈالی۔

کچھ دیر کچّے سے کمرے میں، جہاں چند برتنوں، تین چار پائیوں اور ایک دو ٹوٹے ہوئے صندوقوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ خاموشی چھائی رہی۔ لیکن اس خاموشی میں جانو کی ماں کی سسکیوں کی آوازیں کبھی کبھی سنائی دیتی تھیں۔ وہ اپنے آنسوؤں کو روکنے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔ لیکن ہر دفعہ اس کی آنکھ سے ایک موتی سا چہرے پر لڑھک جاتا تھا۔ ان کی بیٹی بھی رو رہی تھی۔ لیکن اس کا ہر آنسو فوراً اس کپڑے میں جذب ہو جاتا تھا، جو اُس نے ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔ جانو کی دوسری بہن اپنی معصوم اور بھولی بھالی حیران سی آنکھوں سے اس منظر کو دیکھے جا رہی تھی...

اچانک جانو کی ماں سے آنسوؤں کی برسات ختم ہوئی اور اس نے پوچھا۔

"جانو... تم جس ڈاکو کے ساتھ ہو اُس کا نام تم نے قادر خان بتایا ہے نا...؟"

" ہاں ہمارے سردار کا یہی نام ہے۔"

جانو کے منہ سے یہ نعرہ سُن کر وہ اُٹھ کھڑی ہوئی اب اس کی آنکھوں میں بے بسی کے آنسو نہیں تھے بلکہ وہاں انتقام کی آگ میں جلتے ہوئے دو انگارے تھے۔ انہوں نے جانو کو سر کے بالوں سے پکڑا۔ بالوں کو زور سے کھینچا، جانو جوان کے سامنے کی چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا۔ لڑکھڑاتا ہوا اُٹھنے لگا۔ ماں نے اس کے بالوں کو چھوڑا۔ دو زور دار تھپڑ اس کے منہ پر مارے۔ پھر بال پکڑ لیے اور اب تو وہ پاگل ہو گئی۔ وہ جانو کو بُری طرح پیٹ رہی تھی۔ اور روتے ہوئے چلّا چلّا کر کہہ رہی تھی۔

"تم میرے شوہر کے قاتل کے ساتھی ہو۔ تم اپنے باپ کے قاتل کے ساتھی ہو...!"

وہ جب مار مار کر تھک گئی تو بے سُدھ ہو کر چارپائی پر گر پڑی۔ جانو چپکے سے اُٹھا اور گھر سے باہر نکل گیا۔

گھر میں کچھ دیر تک معصوم بچّی کے رونے چلانے کی آوازیں آتی رہیں اور جب غم کا یہ ساز بند ہُوا تو ایک دفعہ پھر ماحول پر سسکیوں بھری خاموشی چھا گئی۔

جانو بوجھل قدموں کے ساتھ چلتا ہوا گوٹھ سے باہر نکل گیا۔ ڈاکو بننے سے پہلے وہ جس زمین کو کاشت کرتا تھا۔ وہاں ایک چھوٹی سی جھونپڑی بنی ہوئی تھی، وہ اس کی طرف جا رہا تھا۔

جانو یہ سوچ رہا تھا کہ سب لوگ یہی کہتے ہیں کہ میرے والد کو پولیس نے گولی ماری تھی، لیکن ماں نے سردار کا نام کیوں لیا؟ اگر ماں یہ سمجھتی ہے کہ سردار نے پولیس سے کہہ کر ایسا کروایا ہوگا تو یہ بالکل غلط ہے۔ پولیس تو خود سردار سے ڈرتی ہے۔ اُس نے مارنا ہوتا تو خود مارتا اُسے تو کسی کا ڈر نہیں... میں صبح ماں سے خود پوچھوں گا۔ اسے پہلے یقین دلاؤں گا کہ اگر قادر خان نے ہی میرے باپ کو مروایا تھا تو اس وقت گھر میں قدم رکھوں گا جب تک قادر خان سے بدلہ نہ لے لوں گا... لیکن ایسا نہیں ہو سکتا... مگر پھر ماں نے ایسا کیوں کیا؟... مجھے اس طرح کیوں مارا... وہ سوچتا رہا... سوچتا رہا۔ نیند اُس سے اتنی ہی دُور تھی جتنا اُس کے باپ کے قتل کا راز اس سے دُور تھا۔

جانو رات کے آخری حصے میں سو سکا تھا۔ اس لئے وہ دن چڑھے تک سوتا رہا۔ سورج کی تیز اور گرم کرنوں نے آکر اُسے اُٹھایا تو وہ آنکھیں ملتا ہوا اُٹھ کھڑا ہُوا۔ تھوڑی دیر بعد اُس کے ذہن میں رات کی ساری باتیں ایک ایک کر کے آتی گئیں۔ وہ گھر کی طرف چل پڑا۔ وہ اپنے کھیت سے باہر نکلا تو ایک آدمی اُسے دیکھ کر رُک گیا۔ یہ

آدمی گوٹھ سے آر ہا تھا۔ اس سے پہلے کہ جانو اُس سے رُکنے کی وجہ پوچھتا اُس نے حیرت سے کہا۔

"جانو تم یہاں ... تمہیں نہیں معلوم ... وہ تیری ماں ہے نا ..." وہ رُک گیا۔

"کیا ہُوا میری ماں کو" جانو نے چیختے ہوئے کہا۔

"تمہاری ماں ... تمہاری ماں مَر گئی ہے ..." آدمی نے ہمت کر کے اپنا جُملہ مکمل کیا۔

جانو کو اپنا دل سر میں دھڑکتا ہُوا محسوس ہُوا۔ وہ پوری رفتار سے گھر کی طرف بھاگنے لگا۔

وہ ہانپتا ہوا گھر پہنچا۔ اُس کی ماں کی چارپائی کے اردگرد کئی عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ جانو نے ماں کا منہ دیکھا۔ اُس کا جی چاہا کہ وہ ایک زوردار چیخ مارے۔ ایسی زوردار چیخ کہ جس کو سُن کر کانوں کے پردے پھٹ جائیں۔ اور پھر وہ اس چیخ کے بعد مَر جائے ... لیکن جب اُس نے چیخ ماری تو نہ کسی کے کان کا پردہ پھٹا اور نہ وہ خود مَرا۔ وہ اپنی مردہ ماں کے ساتھ چمٹ کر پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگا۔ جب اُس کی آنکھوں نے اُس کی آواز کا ساتھ چھوڑ دیا تو ایک آدمی اُسے بازو سے پکڑ کر ایک طرف لے گیا۔ یہ رام چند تھا۔ رام چند کو دیکھ کر جانو کی آنکھیں ایک دفعہ پھر آنسوؤں سے بھر گئیں۔ وہ اب اُس کے گلے لگ کر جی ہلکا کر رہا تھا۔

اپنی ماں کے مَرنے کے چار دن بعد سردار قادر خان کا آدمی جانو کو لینے کے لئے رام چند کے ہاں آیا۔ اُس دوران رام چند نے جانو سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اُس کی بہنوں کو اپنی بیٹیوں کی طرح اپنے ساتھ رکھے گا۔ لیکن اُس نے جانو کو اُس کے باپ کے قتل کے متعلق یہی بتایا کہ اُسے سردار قادر خان نے نہیں بلکہ پولیس نے قتل کیا تھا۔ جانو رام چند کے اس جواب سے مطمئن نہیں ہوا تھا۔

جانو جب سردار قادر خاں کے آدمی کے ساتھ روانہ ہوا تو اُسے یُوں معلوم ہوا کہ اب پیچھے اُس کو دعائیں دینے والا کوئی نہیں رہا۔ بہنوں کو رام چند کے حوالے کر کے وہ ان کے بارے میں کافی بے فکر ہو گیا تھا۔ اب اُسے روپے کی خاطر ڈاکوؤں کے ساتھ رہنے کی بھی کوئی خواہش نہیں تھی۔ اب اُسے اپنی زندگی کا ایک ہی مقصد نظر آ رہا تھا۔ اپنے باپ کے قاتل سے انتقام۔ اپنی ماں کے بارے میں وہ جب بھی سوچتا تو اُسے اپنے آپ سے نفرت سی ہو جاتی ... اگر ماں سچّی ہوئی۔ اگر واقعی قادر خاں ہی میرے باپ کا قاتل نکلا تو پھر اپنی ماں کا قاتل میں ہوں گا ... سارے راستے وہ اسی طرح کی سوچوں میں غرق رہا۔

رات دس بجے کا وقت ہو گا۔ شہر کی بارونق سڑکوں پر بھی ٹریفک کا بوجھ کافی ہلکا ہو گیا تھا۔ سفید رنگ کی ایک پُرانے ماڈل کی بے ڈھب سی کار درمیانی سی رفتار کے ساتھ اپنی منزل کی طرف جا رہی تھی۔ کار

میں تین آدمی سوار تھے۔ اگلی سیٹ پر تو ڈرائیور بیٹھا ہُوا تھا۔ جبکہ پچھلی سیٹ پر موجود دو آدمیوں میں سے ایک کا نام عبدالحق تھا۔ عبدالحق ایک سچے اور پکّے مسلمان دانشور تھے۔ پاکستان کے شیدائی اور ملک دشمن، علیحدگی پسند لوگوں پر سخت تنقید کرنے والوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ وہ اس وقت ایک اجلاس میں شرکت کر کے واپس آرہے تھے۔ ان کے ساتھ ایک صحافی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ایک مشہور اخبار کے لئے عبدالحق صاحب کا انٹرویو کرنا چاہتا تھا۔ وقت کی کمی کی وجہ سے اُنہوں نے اُسے کل شام کا وقت دینے سے معذرت کر لی اور پیش کش کی کہ اگر وہ چاہیں تو ان کے ساتھ گھر چلے چلیں اور راستے میں ہی ان سے جو کچھ وہ پوچھنا چاہتے ہیں، پوچھ لیں۔ صحافی نے ان کی پیشکش شکریے کے ساتھ قبول کر لی۔ اب وہ ان سے مختلف سوال کر رہا تھا اور عبدالحق صاحب کے جوابات ریکارڈ کئے جا رہا تھا۔

کار کا ڈرائیور کافی الجھن کا شکار تھا۔ اس کا خیال تھا کہ کالے رنگ کی شیراڈ کار کافی دیر سے اس کے پیچھے ہے اپنے شک کو دُور کرنے کے لئے اس نے گاڑی کو سروس روڈ پر ڈال دیا، اور اپنی رفتار خاصی کم کر دی۔ اس دفعہ سیاہ شیراڈ اُس کے پیچھے نہیں آئی بلکہ اپنی رفتار سے چلتی ہوئی آگے نکل گئی۔ ڈرائیور نے سُکھ کا سانس لیا۔

یہ کار مال روڈ کو ڈیوس روڈ سے ملانے والی ایک چھوٹی سی ون وے سڑک پر مُڑ گئی۔ یہ سڑک بہت ویران سی تھی۔ ایک دو دفعہ یہاں موٹر سائیکل چھیننے کی وارداتیں بھی ہو چکی تھیں۔ جب اُس نے اس سڑک کا آدھا فاصلہ طے کر لیا تو سامنے سے خم کھاتی ہوئی سڑک پر ایک انتہائی تیز رفتار کار ایک دم ظاہر ہوئی۔ ون وے سڑک پر اچانک اس قدر تیز گاڑی اور پھر اس کی تیز روشنی نے ڈرائیور کو مجبور کر دیا کہ اپنی گاڑی کی رفتار کو تقریباً صفر کر دے۔ عین اُس لمحے تین چار گولیوں کے چلنے کی آوازیں آئیں۔ سفید ٹیوٹا کے بائیں طرف والے اگلے اور پچھلے ٹائر سڑک پر بچھ چکے تھے۔ گاڑی کھڑ کھڑ کی آوازیں نکالتی ہوئی رُک گئی۔ ڈرائیور کو حالات کا اندازہ ہو چکا تھا۔ اس نے چیخ کر عبدالحق اور صحافی کو بھاگ جانے کے لئے کہا۔ وہ خود سب سے پہلے گاڑی سے نیچے اُترا۔ نیچے اُتر کر اُس نے ابھی دوسرا قدم ہی زمین پر رکھا ہوگا کہ ایک آدمی کسی جن کی طرح ظاہر ہوا اور اگلے لمحے اُس نے اپنی بندوق کا بٹ اُس کے سر پر دے مارا۔ ڈرائیور کوئی آواز نکالے بغیر وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ اور وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ عبدالحق اور صحافی ابھی گاڑی میں ہی تھے۔ وہ خوف سے پھٹی آنکھوں سے ڈرائیور ہی کو دیکھ رہے تھے۔ کار کے دونوں دروازوں پر حملہ آوروں نے قبضہ جما لیا تھا۔ ان کے لئے بھاگنے کا اب کوئی موقعہ نہیں تھا۔

"باہر نکلو... جلدی" انھیں حکم دیا گیا.
حکم ماننے کے علاوہ وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے. چپکے سے باہر آ گئے. جونہی وہ باہر نکلے، دونوں کی کنپٹیوں پر بندوقوں کی ٹھنڈی ٹھنڈی نالیاں لگ چکی تھیں.
"اس گاڑی کی طرف چلو" سامنے وہی سیاہ رنگ کی شیراڈ کھڑی تھی جس سے ٹیوٹا کا بدنصیب ڈرائیور اپنے خیال کے مطابق جان چھڑا چکا تھا. عبدالحق آگے آگے جا رہے تھے اور ان کے پیچھے انٹرویو لینے والا صحافی تھا. اچانک صحافی سے پوچھا گیا.
"تم کون ہو؟"
"میں صحافی ہوں"۔ روزنامہ "چنگاری" میں کام کرتا ہوں"
"اپنے اخبار کا کارڈ دکھاؤ"
صحافی نے کارڈ دکھایا۔ اس کی بات پر یقین آجانے کے بعد ایک آدمی کو حکم دیا گیا کہ وہ صحافی کو واپس اسی گاڑی میں آرام کرنے دے. چنانچہ جب صحافی گاڑی کے اندر بیٹھ گیا تو اُس کو چھوڑنے والے نے اس کے ناک پر رومال رکھ دیا. وہ بے ہوش ہو گیا. گاڑی سے باہر پڑے ڈرائیور کو اسی طرح رہنے دیا گیا.
عبدالحق کو سیاہ شیراڈ میں بٹھا کر کلوروفارم سونگھا کر بے ہوش کر دیا گیا. اغوا کرنے والے اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے.

آج ماہِ رواں کی پچیس تاریخ تھی. رام چند صبح سے اخبار کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہا تھا. اُسے اس دن کا بڑی شدت سے انتظار تھا. پھر جونہی اخبار آیا، اس کی نظریں ایک خاص خبر کو تلاش کرنے لگیں. جلد ہی اسے اپنی مطلوبہ خبر مل گئی.
"مشہور دانشور عبدالحق کو اغوا کر لیا گیا"
اس نے جلدی جلدی خبر کی تفصیلات پڑھیں اور اپنے گھر کے خفیہ کمرے میں گیا. وہاں وائرلیس سیٹ لگا ہوا تھا. اُس نے بڑے ماہرانہ طریقے سے پیغام بھیجنا شروع کر دیا.
"ہیلو! نمبر زیرو نائن ون سیون... زیرو نائن ون سیون"
"ہیلو۔ ہاں۔ زیرو نائن ون سیون۔ بولو۔ پیغام دو"
"رام چند بول رہا ہوں. پرندہ پکڑا گیا ہے. میں پنجرے کا انتظار کر رہا ہوں... اوور اینڈ آل"

ڈاکو قادر خان کے ٹھکانے پر آج کل حفاظت کا زبردست انتظام تھا۔ عبدالحق کو اغوا کر کے اسی کے ٹھکانے پر لایا گیا۔ رام چند کے وعدے کے مطابق اغوا کے تیسرے روز عبدالحق کو کسی آدمی کے حوالے کیا جانا تھا۔ لیکن آج چوتھا دن تھا۔ اور قادر خان بے چینی سے غار کے اندر ٹہل رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیوں نہ وہ رام چند کی طرف اپنا آدمی بھیجے۔ اچانک اُسے کچھ شور سنائی دیا۔ اس کے گروہ کے لوگ ایک بھکاری کو پکڑے ہوئے تھے۔ بھکاری سخت شور مچا رہا تھا۔

"سردار۔ اس نے ہمارے ایک آدمی کو گالی دی ہے"

"چھوڑ دو مجھے" بھکاری نے سردار کی طرف دیکھ کر کہا

"چھوڑ دو ... یہ بھکاری نہیں ہے" سردار مسکراتا ہوا بولا۔

جیسے ہی ڈاکوؤں نے بھکاری کو چھوڑا۔ اس نے فوراً اپنی نقلی داڑھی اور بھکاریوں والا میک اپ اُتار دیا۔ اب اُن کے سامنے ۳۰ سالہ ہٹا کٹا آدمی کھڑا تھا۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ پھٹے پرانے اور خستہ حال بوڑھا بھکاری ایک جوان آدمی ہو سکتا ہے۔ اس نے کوئی لمحہ ضائع کئے بغیر کہنا شروع کیا۔

"مجھے رام چند نے بھیجا ہے۔ عبدالحق اور جانو کو میرے ساتھ بھیج دو"

قادر خان کی جیپ عبدالحق، جانو اور رام چند کے آدمی کو لے کر کسی اجنبی مقام کی طرف جا رہی تھی۔ جانو نے آج پہلی دفعہ عبدالحق کو دیکھا تھا۔ جب عبدالحق نے اس کی طرف دیکھا تو وہ اس کی عقابی نظروں کا سامنا نہ کر سکا اور اُس نے نظریں ہٹالیں۔ لیکن عبدالحق اُسے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے اُس نے اس چہرے کو پہلے کبھی دیکھا تھا۔ حالانکہ جانو اپنے گوٹھ سے ان ڈاکوؤں کے علاوہ کبھی باہر ہی نہیں نکلا تھا۔ جب ان کی جیپ اپنی منزل پر پہنچی تو عبدالحق جانو کو پہچان چکا تھا۔

پھر کیا ھوا ؟

یہ جاننے کے لئے آئندہ ماہ دھاڑیل کی سنسنی خیز قسط پڑھنا نہ بھولئے

علم شیطان کے کام کو مشکل بنا دیتا ہے۔ علم حاصل کیجیے۔

آپ بیتی

خصوصی انعام

ایم شہزاد احمد

جلد بازی

زندگی کی دوڑ میں کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے

آج سے تقریباً چھ سال پہلے کا واقعہ ہے۔ ہم لوگ گاؤں میں رہتے تھے۔ میں اُس وقت چوتھی جماعت میں پڑھتا تھا۔ میرا ایک دوست تھا احمر وہ میرا کلاس فیلو بھی تھا اور پڑوسی بھی۔ ہم دونوں میں بہت گہری دوستی تھی۔ ہمارا روزانہ کا معمول تھا کہ ہم دونوں فجر کی نماز پڑھنے کے بعد کھیتوں میں سیر کے لیے نکل جاتے۔ واپسی پر گھر آتے اور ناشتہ وغیرہ کرنے کے بعد اکٹھے اسکول چلے جاتے۔ شام کے وقت ہم ہوم ورک بھی ایک ساتھ بیٹھ کر کرتے تھے۔ ہمارے گھروں سے کچھ دُور ایک گندا نالہ تھا۔ نالے سے آگے والی گلی میں ایک پُرانی سی حویلی تھی۔ جو اب کھنڈر بن چکی تھی۔ صرف اُس کے دو کمرے اور بیرونی دروازہ سلامت تھا۔

حویلی کا بیرونی دروازہ بہت بڑا تھا۔ اور اُس پر اینٹوں سے آرائشی کنگرے بنے ہوئے تھے جیسے قدیم عمارتوں پر ہوتے ہیں۔

سوموار کے دن میں نماز پڑھ کر جائے نماز سے اُٹھا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو احمر کھڑا تھا۔ ”کیا بات ہے احمر؟“ میں نے پوچھا۔ ”آؤ یار سیر کو چلیں۔“ ”اچھا میں ذرا ٹوپی اُتار کر رکھ لوں۔“ تھوڑی دیر بعد میں ٹوپی اُتار کر احمر کے ساتھ گھر سے باہر آ گیا۔

”آؤ دوڑ لگاتے ہیں۔“ احمر نے کہا اور ہم دونوں نے دوڑنا شروع کر دیا، دوڑتے دوڑتے احمر مجھ سے آگے نکل گیا اور اُس نے گندا نالہ عبور کر لیا۔ میں جونہی نالے کے قریب پہنچا، میرا پاؤں پھسلا اور میں نالے میں گر گیا۔ ”احمر رُک جاؤ میں گر گیا ہوں۔“ مگر احمر نہ رُکا اور اُس نے گلی کا موڑ عبور کر لیا۔ اتنے میں ایک زوردار دھماکے

کی آواز آئی اور اُس کے بعد کافی آوازیں اور آئیں۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی عمارت گر پڑی ہو۔ میں جلدی سے نالے سے باہر نِکلا۔ اتنے میں اطراف سے لوگ گھروں سے نکل کر بھاگے۔ میں بھی دوڑ کر اُدھر گیا جدھر سے آوازیں آئی تھیں۔ جونہی میں نے گلی کا موڑ عبُور کیا میں نے دیکھا کہ پُرانی حویلی کا دروازہ اور دیوار گری ہوئی تھی اور لوگ کہہ رہے تھے کہ دروازے کے نیچے کوئی دبا ہُوا ہے۔ جب لوگوں نے ملبہ اُٹھایا تو میری چیخیں نِکل گئیں۔ کیونکہ احمر دروازے کے نیچے دبا ہُوا تھا۔ لوگوں نے اُسے اُٹھا کر جلدی سے چارپائی پر ڈالا۔ چُونکہ وہ منہ کے بل گِرا تھا اس لیے اُس کے سر کے پچھلی طرف سخت چوٹیں آئی تھیں۔ اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی اُس نے دَم توڑ دیا۔ احمر میرا پیارا دوست۔ ہم سب سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جُدا ہو گیا۔

میں آج سوچتا ہوں کہ اُس دِن احمر کو اتنی جلدی کس بات کی تھی کہ میری آوازیں سُننے کے باوجود وہ نہ رُکا۔

اور اگر اُس دِن میرا پاؤں نہ پھسلتا تو آج میں بھی زندہ نہ ہوتا۔

احمر کی ناگہانی موت سے اُس کی والدہ کا ذہنی توازن بگڑ گیا ہے اور اُس کے والد کو بالکل چُپ لگ گئی ہے۔

میں جب بھی اُس کے گھر جاتا ہوں تو اُس کی امّی مجھ سے کہتی ہیں "بیٹا احمر باہر گیا ہُوا ہے ابھی آجائے گا تم بیٹھو"۔ جب میرے آنسو نِکلنے لگتے ہیں تو کہتی ہیں" وہ تم سے ناراض ہو گیا تم اس لیے رو رہے ہو'۔ بیٹا چُپ کرو' ابھی احمر آتا ہے تو میں اُسے ڈانٹتی ہوں' وہ تم سے راضی ہو جائے گا"۔ یہ سُن کر میں اپنی نَم ناک آنکھیں لیے خاموشی سے باہر آجاتا ہوں۔ شاید میں یہ واقعہ کبھی نہ بُھلا سکوں۔

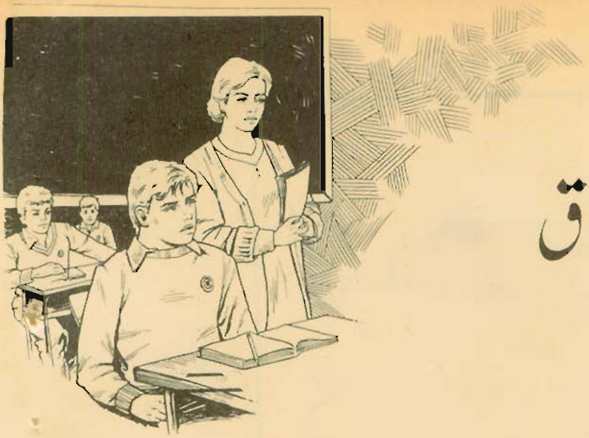

اتفاق

شاہنواز فاروقی

اردو کے پیریڈ میں ہمیں مس رباب نے
دو چار کل کیا تھا بڑے پیچ و تاب سے

لکھنے کو اتفاق پہ مضمون دے دیا
کڑوا سا منہ میں گویا کہ معجون دے دیا

موضوع کا نام سنتے ہی بھنا گیا دماغ
گُل ہو گئے دماغ کے جلتے ہوئے چراغ

ہم نے تو اتفاق پہ سوچا نہ تھا کبھی
پھر یہ کہ اتفاق کو دیکھا نہ تھا کبھی

بیٹھے رہے قلم کو لئے دس منٹ تلک
گھورے گئے خلا میں نہ جھپکی ذرا پلک

کچھ دیر بعد دوستو بس اتفاق سے
آنے لگے خیال بڑے طمطراق سے

پھر ہم نے اتفاق کے بارے میں یہ لکھا
ہے لفظ اتفاق کا اک اپنا فلسفہ

ہوتے ہیں اتفاق سے کچھ لوگ پاس، فیل
آتی ہے اتفاق سے بروقت کوئی ریل

ملتے ہیں اتفاق سے احباب اب بھلے
ہوتے ہیں اتفاق سے حل قومی مسئلے

آتے ہیں اتفاق سے رہزن گرفت میں
جائیں گے اتفاق سے لیڈر بہشت میں

ملتے ہیں اتفاق سے ایمان دار لوگ
جاتا ہے اتفاق سے یہ کینسر کا روگ

ہوتا ہے اتفاق سے رشوت بغیر کام
ہوتا ہے اتفاق سے عالِم کا احترام

ہوتے ہیں اتفاق سے دنیا میں حادثے
بدلے ہیں اتفاق سے ابّو کے فیصلے

جاتی ہیں اتفاق سے قومیں عروج پہ
یہ بات ہم نے سمجھی نہیں اتفاق سے

القصہ مختصر! اے میرے پیارے دوستو
ہے دخل زندگی میں بہت اتفاق کو

بی امّاں

محمد خالد جاوید

ایک عظیم ماں کی کہانی جس کی گود میں آزادی کے پروانوں نے پرورش پائی

وہ بہت عظیم عورت تھی۔ صابر، حوصلہ مند اور فرض شناس۔ ان خوبیوں نے اُس کے اندر جمع ہو کر اُسے بہت عظیم بنا دیا تھا۔ عین عالمِ جوانی میں اُس کے شوہر کا انتقال ہو گیا تھا۔ شوہر بھی ایسا کہ انتہائی ذمّے دار اور محبّت کرنے والا۔ یہ سانحہ کیا تھا ایک قیامت تھی جو اس پر گزر گئی مگر اُس نے اُسے اللہ تعالیٰ کا حکم سمجھا اور اس پر صبر کیا۔ اس کے بچّے ابھی بہت چھوٹے تھے۔ شوکت علی کی عمر تو خیر پانچ یا چھ سال کی تھی مگر ننھا محمّد علی تو بہت ہی چھوٹا تھا۔ اس کی عمر صرف ۱۶ ماہ تھی اور وہ ابھی دودھ پیتا تھا۔ اُس نے حوصلے سے کام لیا اور ان بچّوں پر اپنی توجّہ مرکوز کر دی۔ وہ اکثر کہا کرتی تھی کہ عورتیں مردوں کو صحیح راستے پر لگا سکتی ہیں۔ اس کا یہ بھی کہنا تھا کہ مردوں کے لئے سب سے بڑی صفت ہمّت و شجاعت ہے اور عورتیں ہی مردوں کو باہمّت اور طاقتور بنا سکتی ہیں۔ اپنے اس قول کو اُس نے خود اس طرح نبھایا کہ اپنے بچّوں کی بہترین

پرورش کی۔ اُنہیں وقت کی اعلیٰ تعلیم دلائی اور جب وہ تعلیم سے فارغ ہو گئے تو ایک روز اُس نے انھیں بلاکر اپنے سامنے بٹھالیا۔ اُس نے کہا۔

"میرے بچّو! میں نے تم کو عمدہ طریقے سے پرورش اور اعلیٰ تعلیم مہیا کرنے کی پوری پوری کوشش کی ہے۔ اب میں چاہتی ہوں کہ تم لوگ بہادر سپاہی بنو۔"

دونوں بھائیوں نے ایک دوسرے کی طرف مُسکرا کے دیکھا۔ اس مُسکرا کے دیکھنے کے پیچھے شاید یہ وجہ تھی کہ اُن کے کالج میں اُن کی جی داری اور بہادری کی بڑی شہرت تھی۔ دونوں بھائیوں کا ڈیل ڈول بہت اچھا تھا۔ اور کیوں نہ ہوتا، ورزش کا انہیں شوق تھا اور کرکٹ کے وہ بہترین کھلاڑی تھے۔ وہ بھی آخر اُن کی ماں تھی سمجھ گئی کہ بچے کیوں مُسکرا رہے ہیں۔ بچوں کو مُسکراتے دیکھ کر وہ بھی خوش ہوئی مگر اپنی بات کی مزید تشریح کرتے ہوئے اُس نے کہا۔

"شجاعت دکھانے کے بہت سے طریقے ہیں۔ کسی کی لاٹھیوں سے خبر لینا شجاعت نہیں ہے، لڑنا تو جانوروں کی سی ہمت دکھلانا ہے۔ اصلی ہمت یہ ہے کہ دوسروں کو آرام پہنچاؤ اور اُن کی مدد کرنے کی کوشش کرو۔ تم جتنی زیادہ قربانیاں کرو گے، دوسروں کے لئے جتنی تکلیفیں اُٹھاؤ گے اتنے ہی زیادہ با ہمت کہلاؤ گے۔"

اُس روز اُس نے اُنہیں بہت سی باتیں سمجھائیں۔ اس نے اُنہیں یہ بھی بتایا کہ ہر عورت کی عزت یکساں ہے اور اُنہیں چاہیے کہ ہر قوم کی عورتوں کی ویسی ہی عزت کریں، جیسی اپنی ماں کی عزت کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اُس نے انہیں مذہب کی اہمیت، مذہب سے وابستگی اور اس کے لئے سرفروشی کا درس بھی دیا۔

یہ اُس وقت کا ذکر ہے جب ابھی ہمارا پیارا وطن پاکستان وجود میں نہیں آیا تھا۔ اور یہاں انگریزوں کی حکومت تھی۔ لیکن اس بہادر عورت نے اپنے بیٹوں کو آزادی کا احساس دلایا اُس نے کہا

"ہم مسلمان ہیں، ہمیں سوائے خدا کے کسی کا خوف نہیں ہے اور ہم صرف اللہ تعالیٰ کے احکام کے پابند ہیں ہم کسی غیر کی غلامی نہیں کر سکتے۔"

بیٹوں نے اپنی عظیم ماں کی یہ ساری باتیں توجّہ سے سنیں اور دل میں اُتار لیں۔ وہ اپنی ماں کے بہت فرمانبردار تھے۔ چنانچہ اُس دن کے بعد سے ان کی زندگیوں کے دھارے بدل گئے۔ اب ان کے سامنے اُن کی زندگی کا مقصد بالکل واضح تھا۔ وہ جہاں جہاں بھی گئے انھوں نے ہر ایک کو یہ پیغام دیا کہ سب دنیا کے مسلمان ایک ہیں۔ اُن کے فائدے اور نقصانات مشترک ہیں۔ مسلمانوں کو ایک دوسرے کا خیر خواہ ہونا چاہیئے ساتھ ہی ساتھ انہوں نے یہ بھی کہا کہ مسلمان غلام نہیں رہ سکتے انہیں آزادی چاہیے۔ اپنی بات کو ملک کے

گوشے گوشے میں پھیلانے کے لئے ان بھائیوں نے اخبارات نکالے۔ اُردو میں بھی اور انگریزی میں بھی مگر حکومت سے یہ سب برداشت نہ ہوا۔ اُس نے اخبارات کو بند کروا دیا اور ضمانت کی رقم ضبط کر لی۔ ہزاروں روپے ضائع ہوئے لیکن یہ بھائی پُرعزم تھے اور اُن کی پُشت پر ایک حوصلہ مند ماں تھی۔ چنانچہ وہ اپنے پیغام سے اپنے کام سے بالکل باز نہ آئے۔

انہی دنوں ملک میں ایک تحریک چلی جو انگریز حکومت کے خلاف تھی۔ اسے تحریکِ خلافت کہتے ہیں۔ محمد علی، شوکت علی دونوں بھائی اس تحریک کے قائد تھے۔ اس تحریک نے پورے متحدہ ہندوستان کے عوام کو بیدار کر دیا۔ خاص طور پر مسلمان تو جیسے خوابِ غفلت سے جاگ پڑے۔ حکومت اس تحریک سے خوفزدہ ہوگئی۔ اور اُس نے اُنہیں گرفتار کر لیا اور دونوں بھائیوں کو جیل بھیج دیا۔ یہ عظیم عورت اپنے بیٹوں سے ملنے کے لئے جیل گئی تو راستے میں بہت سے لوگ ملے اُنہیں جب یہ خبر ہوئی کہ یہ شوکت علی اور محمد علی جیسے حوصلہ مند بیٹوں کی ماں ہے تو انہوں نے ہمدردی کے طور پر اُس کے بیٹوں کی درازئ عمر اور ترقی کے لئے دعائیں کرنا شروع کر دیں۔ ماں کو جب اس کا پتہ چلا تو اُس نے کہا۔

"تم لوگوں کو شرم آنی چاہئے کہ تم میرے لڑکوں کو درازئ عمر کی دُعا دیتے ہو تم کو تو اپنے ملک اور انسانوں کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد ہونے کی دُعائیں کرنا چاہئے۔ میرے لئے میرے بچے اتنے پیارے نہیں ہیں جتنے اللہ کی پیاری مخلوق، اگر میں خدا کی مخلوق کی بھلائی کے لئے دعا کروں گی تو خدا میری اور میرے بچوں کی مدد کرے گا۔" اس کے بعد ایک نظم لکھی گئی جو ملک کے گلی کوچوں میں گائی جانے لگی۔

بولیں اماں محمد علی کی — جان بیٹا خلافت پہ دے دو

حکومت ان ماں بیٹوں کو مکمل طور پر تنگ کرنے پر تُلی ہوئی تھی۔ چنانچہ دونوں بھائیوں کو مختلف مقامات پر منتقل کرنا شروع کر دیا گیا۔ جہاں جہاں یہ دونوں بھائی لے جائے گئے، ان کی ماں بھی اُن کے ساتھ ساتھ گئی۔ خاندان والوں نے، رشتہ داروں نے یہ کیفیت دیکھی تو اُسے سمجھایا کہ

"اپنے لڑکوں کی زندگی کیوں برباد کر رہی ہو۔ ایسی زبردست حکومت کے خلاف یہ لوگ کیا کر سکتے ہیں؟"

اس بہادر عورت نے جواب دیا کہ

"ہاں! وہ لوگ زبردست حکومت کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے لیکن خدا نے مجھ کو خربوزہ کے دو بیج عطا کئے ہیں جن کی میں نہایت احتیاط سے پرورش کروں گی اور خدا کی عنایت سے یہی عظیم الشان بیل کی طرح پھیل جائیں گے اور ان سے نئی نئی بیلیں پھوٹیں گی۔"

انگریز حکومت ان بھائیوں سے اس قدر خوفزدہ تھی کہ مختلف اور جھوٹے مقدمات لگا لگا کر ان کی قید کا عرصہ پانچ سال تک بڑھا دیا مگر ان ماں، بیٹوں کا ایثار اور محنت اپنا رنگ دکھا رہے تھے۔ ان کی آوازوں میں بہت سی آوازیں ملتی چلی جا رہی تھیں۔ اب لوگوں نے اس عظیم ماں کو دیکھا تو کچھ نہ کہہ سکے۔ البتہ ان سب کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ بوڑھی ماں نے جب یہ دیکھا تو اُس اپنا نقاب اُٹھا دیا اور کہا۔

"اگر محمد علی، شوکت علی گرفتار ہو گئے تو رنج و غم کی بات نہیں ہے۔ دیکھو میں تمہاری ماں ہوں۔ ان کو جیل جانے دو کچھ غم نہ کرو، اگر وہ جیل جا رہے ہیں تو اس میں غم کی کیا بات ہے۔ میں تم سب کو اپنا بیٹا تسلیم کرتی ہوں جاؤ ان کے کام کو، ان کے پیغام کو آگے بڑھاؤ۔"

اور جب اُس کی اپنے بیٹوں سے ملاقات ہوئی تو وہ جیل کے لباس میں تھے۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ماں کے دل پر ان کو اس لباس میں دیکھ کر کیا گزری ہوگی۔ مگر اُس نے نہایت حوصلہ مندی سے ان کو یہ کہا کہ۔

"دیکھو!! گھر کی آسائش اور آرام کو یاد کر کے افسوس نہ کرنا اگر تم نے کسی قسم کی کمزوری ظاہر کی تو سمجھ لو کہ تم میرے بچے نہیں ہو۔"

اب بچوں سے کوئی کمزوری کیسے ظاہر ہو سکتی تھی۔ حکومت نے جب دیکھا کہ یہ لڑکے نہ دبتے ہیں، نہ جھکتے ہیں نہ اپنے ارادوں سے باز آتے ہیں تو اُس نے ایک نیا طریقہ اختیار کیا۔ اُس نے اپنے ایک افسر کو بھیجا اور اس کے ہاتھ یہ پیغام دیا کہ اگر وہ دونوں بھائی آئندہ کے لئے اپنی روش سے باز آجائیں، حکومت کی مخالفت چھوڑ دیں، آزادی کے نعرے لگانا بند کر دیں اور دنیا کے دوسرے مسلمانوں کے معاملات میں دلچسپی لینا چھوڑ دیں تو اُن کی رہائی ہو سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا جواب کیا ہو سکتا تھا۔ وہ افسر ناکام و نامراد ہو کر واپس گیا۔ اگلے روز جب ماں اپنے بیٹوں سے ملنے کے لئے جیل گئی تو دوسری باتوں کے ساتھ ساتھ بیٹوں نے اس واقعے کا بھی ذکر کیا

"پھر تم نے کیا جواب دیا؟" ماں کی ساری نرمی رخصت ہو گئی تھی اُس کے لہجے میں گرج اور اُس کے چہرے پر جوش کی سُرخی تھی اور اُن کے جواب کا انتظار کئے بغیر وہ شیرنی کی طرح بپھر کر بولی۔

"میں نے تمہیں اس لئے پالا ہے کہ تم اسلام کے سپاہی بنو گے۔ اگر تم نے ذرا بزدلی یا کم ہمتی دکھائی تو نہ صرف یہ کہ میں دودھ نہیں بخشوں گی بلکہ ایسے کسی تحریری وعدے پر تمہارے دستخط کرنے کے لئے قلم اُٹھانے سے پہلے، ان بوڑھے ہاتھوں سے جن میں اب صرف ہڈیاں رہ گئی ہیں۔ میں تم دونوں کا گلا گھونٹ دوں گی۔" ایسی ہی بلند مرتبہ مائیں ہوتی ہیں جن کے قدموں کی برکت سے قوموں کے حالات بدل جاتے ہیں۔

اور انقلاب برپا ہوتے ہیں۔ اس عظیم ماں نے جو پیش گوئی کی تھی کہ "میرے بچے عظیم الشان بیل کی طرح پھیل جائیں گے اور ان سے نئی نئی بیلیں پھوٹیں گی۔ وہ حرف بہ حرف پوری ہوئی۔ تاریخ میں مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی جوہر کے نام ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ جن سے یہ تحریک۔ تحریکِ پاکستان شروع ہوئی اور ان ناموں سے بھی اُوپر ایک نام سدا جگمگاتا رہے گا۔ اس عظیم خاتون کا نام جس کے یہ بیٹے تھے۔ ننھے محمد علی نے اُسے "بی اماں" کہا۔ اور پھر آہستہ آہستہ وہ سب کے لئے "بی اماں" ہوگئیں۔

نپولین کہا کرتا تھا کہ "میں کچھ نہ ہوتا، اگر میری ماں نے مجھ میں یہ جوہر پیدا نہ کئے ہوتے"

نپولین کی ماں نے ایک بیٹے کو دلاور اور عظیم بنایا، مگر بی اماں نے ہندوستان کے لاکھوں مسلمانوں کو جواں ہمّت اور بلند حوصلے کا مالک بنا دیا۔

اے اللہ!! ہماری ماؤں کو ایسا ہی باہمّت اور عظیم بنا دے۔ (آمین)

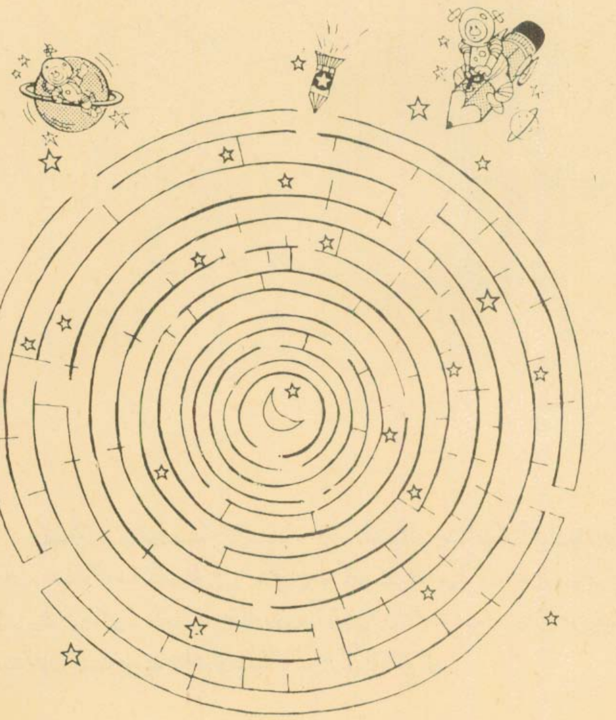

خلانورد

چاند کا راستہ

بھول گئے ہیں

آئیے اُن کی

مدد کریں

اِک اِک کر کے کھائیے
کتنے سیب بتائیے ؟

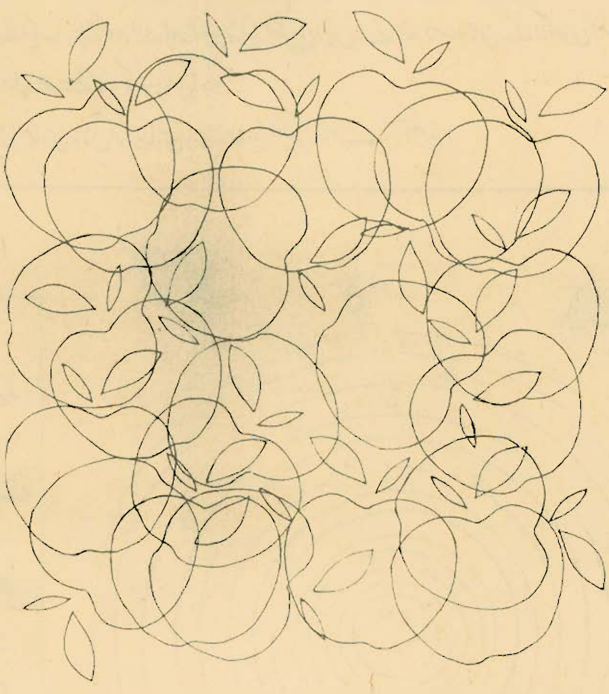

ایک انگریزی محاورے کا ترجمہ ہے کہ "ہر روز ایک تازہ سیب آپ کو ڈاکٹر کے پاس جانے سے باز رکھتا ہے" یہاں آپ کو کھانے کے لئے نہیں البتہ کچھ سیب گننے کے لئے دیئے جا رہے ہیں۔ پہلے آپ پوری توجہ سے گنیے پھر اپنے کسی ساتھی سے گنوائیے۔ یقیناً دونوں کی گنتی میں فرق ہوگا... اب تیسری مرتبہ ہر سیب کو گنتے جائیے اور پنسل سے نشان لگاتے جائیے۔ معلوم ہو جائے گا... کس کی گنتی صحیح تھی۔

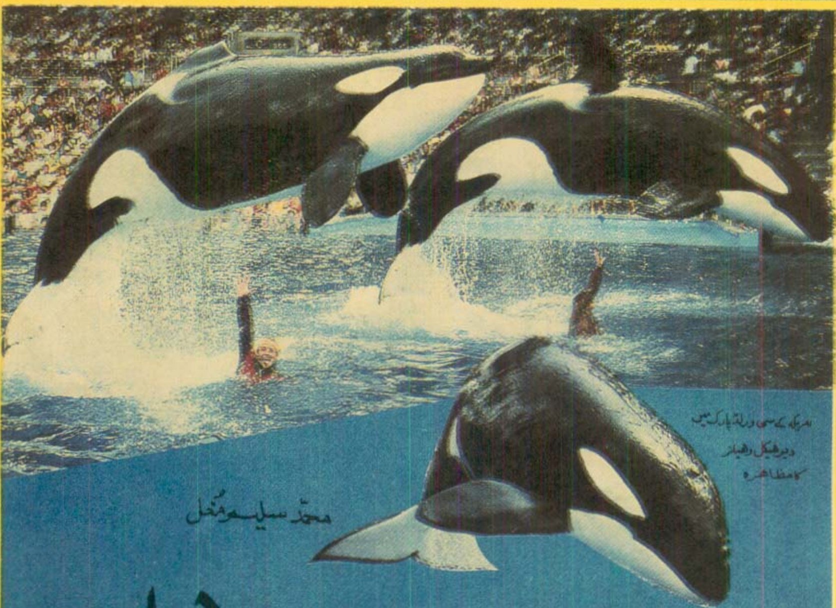

امریکہ کے سی ورلڈ پارک میں
دیو ہیکل وھیلز
کا مظاہرہ

محمد سلیم مغل

وھیل کے کھیل

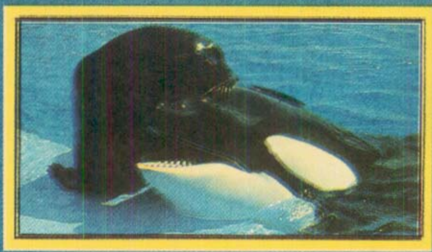

ڈولفنے اور سیل ، اتنی محبت ، اتنا پیار

وھیل بظاہر تو مچھلیوں کے ایک خاندان کا نام ہے جس کی لاتعداد اقسام ہیں لیکن سچ پوچھیے تو یہ ایک ایسی دیو ہیکل سمندری مخلوق ہے جس کو دیکھ کر انسان کی گھگھی بندھ جاتی ہے سمندر کے سفر میں وہیل سے واسطہ پڑ جائے تو موت کا منظر آنکھوں میں گھوم جاتا ہے۔ اپنی ایک ٹکر سے چھوٹے جہازوں کو ہلا کر رکھ دینا۔ لانچوں اور کشتیوں کو الٹ دینا وہیل کے لئے معمولی بات ہے سمندر میں سفر کرنے والے ملاح، سیاح اور مچھیرے بتاتے ہیں کہ سمندر میں خطرات کے لمحے، سمندری طوفان، سرکش لہر یا بڑے بڑے بھنور کی وجہ ہی سے نہیں ہوتے بلکہ اکثر اوقات وہیل کا نظر آجانا بھی مصیبت بن جاتا ہے اور اگر خدانخواستہ وہیل مچھلیاں غول کی صورت میں حملہ آور ہوں تو بہت بڑی تباہی

کا باعث بن سکتی ہیں. کشتیاں اُلٹ دینے اور لوگوں کو ہڑپ کر جانے کے کئی ایسے واقعات رُونما ہو چکے ہیں جن کا تصوّر ہی رونگٹے کھڑے کر دیتا ہے

کیا واقعی یہ مچھلیاں اتنی خطرناک ہوتی ہیں؟

اس سوال کا جواب پانے کے لئے سائنس دانوں

اور حیوانیات کے ماہرین نے تحقیق کے جال سمندروں میں ڈال دیئے... تب پتہ یہ چلا کہ وہیل کو اگر اپنی زندگی کے بارے میں کسی طرح کا خطرہ لاحق نہ ہو تو وہ کبھی خطرہ نہیں بنتیں، بلکہ اگر ان سے محبت کی جائے تو اس محبت کا حق بھی ادا کرتی ہیں۔ وہیل پر تحقیق کرنے والے ایک امریکی جوڑے نے ایک ماہ سے زیادہ عرصہ ہزاروں وہیل کے درمیان ایک ربڑ کی بوٹ میں رہ کر گزارا مگر بقول ان کے کبھی کسی وہیل نے انھیں نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کی. اس لئے کہ وہ خود بھی اُن کے لئے بے ضرر تھے.

ہم لوگ ابھی تک وہیل کے خوف سے سہمے ہوئے ہیں جبکہ دوسری طرف وہ لوگ بھی ہیں جو وہیل کو اپنے اشاروں پر نچا رہے ہیں۔ ان صفحات پر شائع شدہ رنگین تصاویر گواہ ہیں کہ سمندری مخلوق کی بے پناہ قوت پر انسانی ذہن کس قدر حاوی ہے۔

اب تک تو ہم نے یہی سنا تھا کہ ترقی یافتہ ممالک کے چڑیا گھروں میں ڈولفن کے کرتب دکھائے جاتے ہیں۔ مگر ڈولفن تو ڈولفن، دیکھتے ہی دیکھتے۔ وہیل نے بھی ڈولفن کی طرح کے کمالات دکھانا شروع کر دیئے۔ ویسے ہم آپ کو بتا دیں کہ ڈولفن بھی وہیل کی رشتے دار ہے اور اسی کے خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ دیگر حیوانی مخلوق کی طرح وہیل کس طرح انسانی توجہ اور تحقیق کا موضوع بنی ہوئی ہے۔ اس کا اندازہ آپ امریکہ میں پیش آنے والے ان چند واقعات سے لگا سکتے ہیں۔ جن کی تفصیل اور تصاویر یہاں ہم آپ کے مطالعے کے لئے دے رہے ہیں

وہیل کو ساحل سے ایکوریم تک لانے کے لئے اسٹریچر پر ڈالا جا رہا ہے۔

وہیل پر سائنس دانوں نے ریڈیو ٹیگ لگا دیا

۳ دسمبر ۱۹۸۶ء کو بوسٹن کے قریب ساحل سمندر پر رہنے والوں نے دیکھا کہ ایک مصیبت زدہ وہیل سمندر کے کنارے تیرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ لوگوں نے بغیر وقت ضائع کیے، بوسٹن میں واقع نیو انگلینڈ ایکوریم کے سائنس دانوں کو طلب کیا جنہوں نے بڑی محنت کے بعد بالآخر وہیل کو گہرے پانی میں دھکیل دیا۔ ایک ماہ کے بعد پھر ایسا ہی واقعہ ہوا۔

بلکہ ایسے کئی واقعات مشاہدے میں آئے کہ وہیل گہرے پانیوں کے بجائے ساحل پر آکر پھنس جاتی ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ یہ سوال سائنس دانوں کی جُستجو اور شوق کا موضوع بن گیا۔ کیا تیز لہریں انہیں اپنے ساتھ بہا کر لے آتی ہیں یا وہیل خود تکلیف کے عالم میں ساحل کی طرف آجاتی ہیں۔ کوئی وجہ تو ہوگی؟ سائنس دانوں نے اس پر تحقیق کا قصد کیا۔

اکتوبر ۱۹۸۷ء میں پھر ایسا واقعہ ہوا۔ الاسکا کے برفیلے ساحل پر تین وہیل پھنس گئیں اور واپس نہ

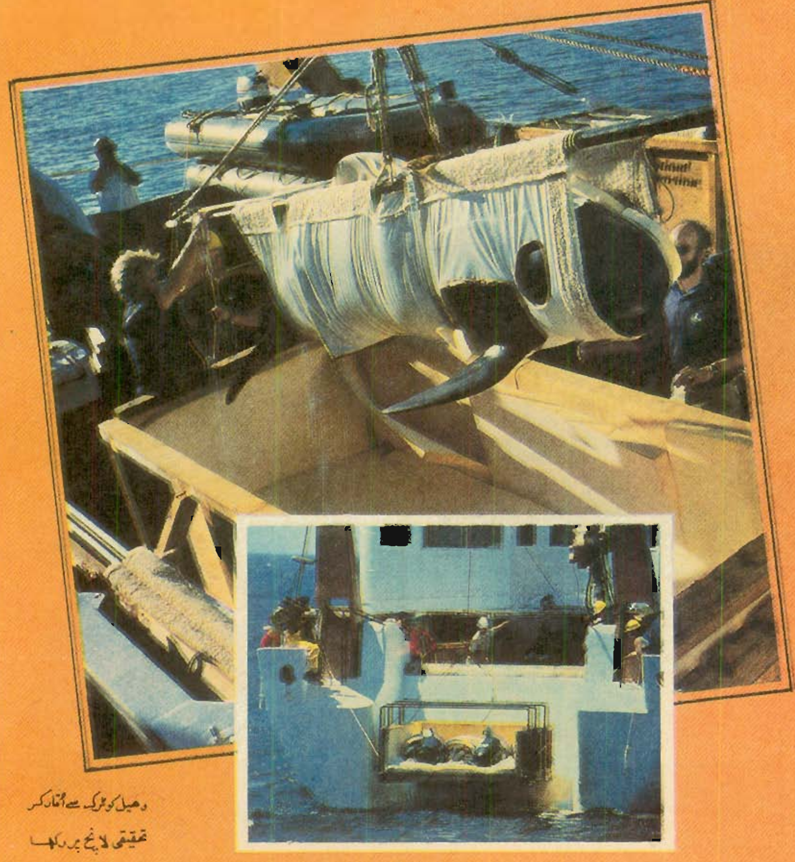

وھیل کو ٹرک سے اُٹھا کر
تحقیقی لانچ پر رکھا
جا رہا ہے ۔

گہرے پانیوں میں وھیل کی واپسی لانچ سے اُتارنے کا ایک منظر

جاسکیں ۔ اس بار سائنس دان ان تینوں وھیل کو اُٹھا کر نیو انگلینڈ ایکو ریم میں لے آئے ۔ ان کی عمریں ڈیڑھ سال کے لگ بھگ ہوں گی ۔ ان تینوں کے نام رکھ دیئے گئے ۔ ٹیگ ، نایچ اور بے بی ۔ تینوں کو ایکو ریم کے بڑے سے تالاب میں رکھا گیا ۔ ان کی صحت کی جانچ پڑتال ہوئی ۔ ابتداً میں دو وھیل نے کھانے سے انکار کر دیا اور اُن کی صحت بھی گرنا شروع ہوئی مگر پھر ماہرین کی توجہ اور دواؤں کی بدولت اُن کے رویے میں تبدیلی آئی اور انھوں نے کھانا شروع کر دیا ۔ سات

ماہ تک مختلف تجربات کے بعد سائنس دانوں نے ان وھیل پر ریڈیو ٹیگ لگا کر انھیں سمندر میں ایسے مقام پر چھوڑ دیا جہاں بہت سی وھیل پہلے سے موجود تھیں ریڈیو ٹیگ کی بدولت وھیل کی صحت کے اور نشو و نما کے بارے میں پتہ چلتا رہتا ہے ۔ اس طرح گویا وھیل کی نسل کی بقا، اور اضافے کے لیئے یہ تجربہ انتہائی اہم اور مؤثر ثابت ہوا ۔ ان تمام تجربات میں عام انسان کے لیئے دلچسپی کی چیزیں ان کا سمندر سے نکالا جانا ، پھر ٹرک پر لانا ۔ انھیں فوری طبی امداد دینا

اور پھر ریڈیو ٹیگ کے بعد واپس سمندر میں چھوڑنا ہے
امریکہ کے سی ورلڈ پارک میں وہیل کے کرتب
دیکھنے کے لئے ہزاروں لوگ روزانہ آتے ہیں اور
اس دیوہیکل مچھلی کو ڈولفن کی طرح ناچتے، کودتے
دیکھ کر خوش بھی ہوتے ہیں اور حیران بھی۔

وہیل کے بارے میں آیئے ہم آپ کو کچھ
ایسی بنیادی معلومات سے آگاہ کریں جو یقیناً
آپ کی دلچسپی اور علم میں اضافے کا باعث ہوں گی۔

دودھ دینے والے جانداروں میں وہیل
مچھلی دنیا کا سب سے بڑا جانور ہے۔

اس دیوہیکل سمندری جانور کی ۹۲ اقسام
دنیا کے مختلف سمندروں میں پائی جاتی ہیں۔ وہیل
کے خاندان میں سب سے چھوٹی مخلوق ڈولفن
مچھلی ہے۔ آپ کبھی ڈولفن اور وہیل کو غور سے
دیکھیں تو آپ کو دونوں میں مشابہت نظر آئے گی۔

ماہرینِ حیوانیات کی یہ تحقیق دلچسپی سے
خالی نہ ہوگی کہ سمندر کا یہ عظیم الجثہ جانور ابتدا میں
خشکی پر رہا کرتا تھا۔ پھر کسی وجہ سے سمندر میں
چلا گیا۔ سمندر میں وہیل کی ٹانگیں آہستہ آہستہ
چپو جیسی بن گئیں اور پچھلی ٹانگیں غائب ہوگئیں۔
خون کی گردش اور سانس لینے کے نظاموں نے
بھی اپنے آپ کو سمندر کی فضا کے مطابق ڈھال
لیا اور یوں یہ جانور سمندر کی سب سے بڑی مچھلی
سمجھا جانے لگا۔

ساحل تک آجانے والی ایک چھوٹی وہیل اور سائنس دان

یوں تو وہیل کی ۹۲ اقسام پائی جاتی ہیں۔ لیکن اس کی دو ذیلی اقسام ہیں۔ (۱) دانت والی (۲) بغیر دانت کے۔

دانت والی اقسام میں بعض وہیل کے دانت ۲۶۰ تک ہوتے ہیں اور بعض کے صرف ۲ ہوتے ہیں۔ دانت والی وہیل کی ایک قسم ایسی بھی ہے۔ جس کا صرف ایک دانت ہوتا ہے جو سونڈ کی طرح آگے نکلا ہوتا ہے۔

وہیل کی ایک مشہور قسم نیلی وہیل ہے جو صرف جنوبی سمندروں میں پائی جاتی ہے۔ نیلی وہیل ۱۰۰ فٹ لمبی اور ۱۲۰ ٹن وزنی ہوتی ہے۔ آپ اندازہ کیجئے کہ ہاتھی کا وزن زیادہ سے زیادہ ۴ ٹن

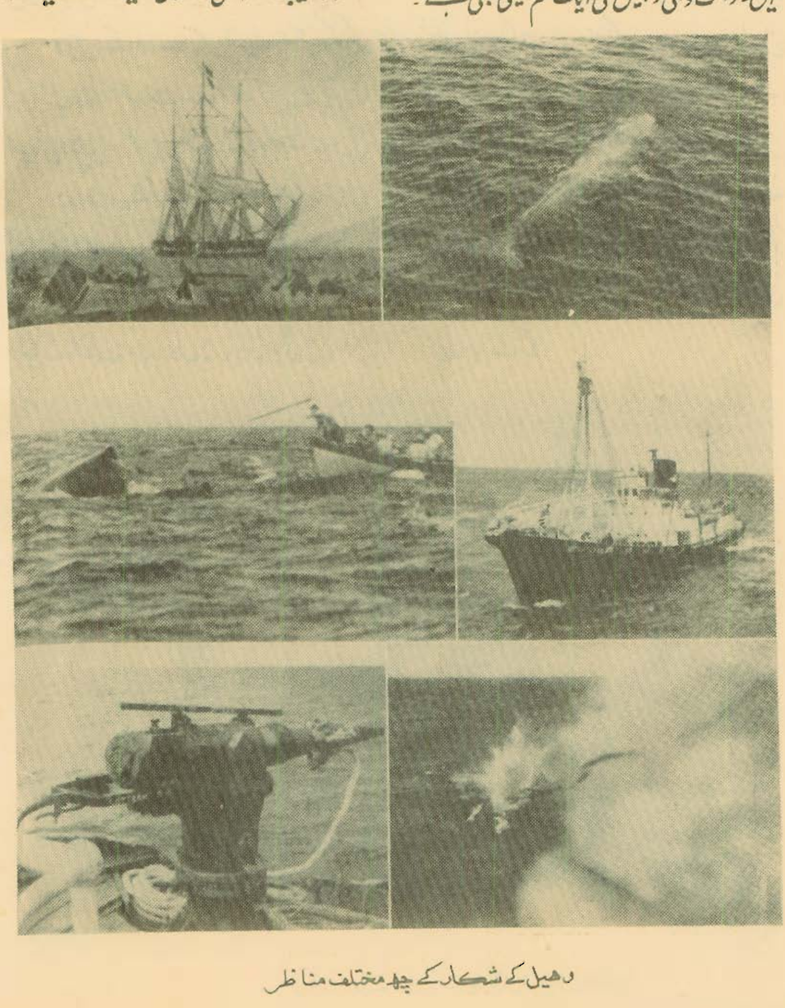

وھیل کے شکار کے چھ مختلف مناظر

ہوتا ہے۔ ایسے میں ۱۲۰ ٹن کی وہیل اپنے قدو قامت کے اعتبار سے کیسی ہوگی؟

اس میں ۲۵ ٹن چربی ہوتی ہے اور اس کا دل ۸۰۰ پونڈ وزنی ہوتا ہے۔

وہیل کی مادہ صرف ایک بچہ دیتی ہے۔ جو ۲۴ فٹ لمبا ہوتا ہے۔

وہیل کی خوراک سمندری کیڑے مکوڑے اور چھوٹی مچھلیاں ہیں۔ یہ بھوک کے وقت اپنے منہ میں بہت سا پانی بھر لیتی ہے۔ منہ بلند کرتی ہے تو پانی باہر چلا جاتا ہے اور کیڑے مکوڑے معدے میں چلے جاتے ہیں۔

وہیل ایک وقت میں ایک ٹن سے زیادہ خوراک کھا جاتی ہے۔

وہیل کبھی کبھار سانس لینے کے لئے منہ پانی سے باہر نکالتی ہے... اُسی وقت شکاری اُسے شکار کرتے ہیں۔

ایک خاص قسم کا نیزہ جسے ہارپون کہا جاتا ہے۔ وہیل پر پھینکا جاتا ہے۔ جو اُس کے جسم کی گہرائی میں داخل ہو کر پھنس جاتا ہے۔ یہ نیزہ ایک لمبی رسی سے بندھا ہوتا ہے۔ رسّی کو کھینچ کر وہیل کو باہر نکال لیا جاتا ہے۔

وہیل کے شکار کے لئے آج کل ایک مخصوص قسم کی توپ استعمال کی جاتی ہے۔ وہیل کا تیل خلائی راکٹوں، میزائیلوں اور مشینوں میں استعمال ہوتا ہے۔ مچھیرے اسے گوشت کے لئے شکار کرتے ہیں جو جاپان میں بہت مقبول ہے۔

وہیل کی آنتوں سے حاصل ہونے والا موی مادہ فرانسیسی عطریات کا ایک اہم جزو ہے۔

وہیل کے بڑھتے ہوئے شکار سے یہ خطرہ پیدا ہو چلا تھا کہ کہیں یہ نسل ختم ہی نہ ہو جائے۔ لہٰذا ۱۹۷۶ء میں انٹرنیشنل وہیلنگ کمپنی کا اجلاس ہوا۔ جس میں اس کے شکار کو محدود کرنے کے لئے سالانہ کوٹہ مقرر کیا گیا۔

اس نسل کو بچانے کے لئے عالمی سطح پر بہت سی کوششیں جاری ہیں۔

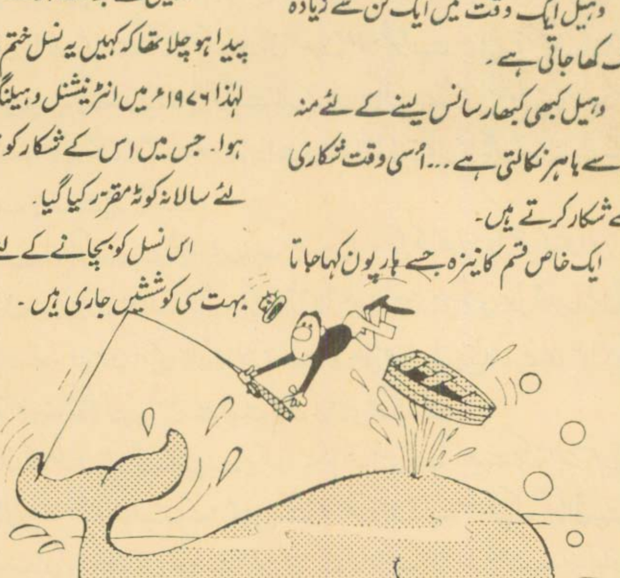

مچھلی پکڑنا غضب ہو گیا

خدا نے جس طرح پانچ انگلیاں یکساں نہیں بنائیں ۔ اس طرح انسانوں کی ناک بھی ایک سی نہیں بنائی ۔ بعض ناکیں چپٹی ہوتی ہیں ۔ بعض اونچی کچھ موٹی کچھ پتلی چھوٹی اور لمبی اور بعض اوقات اتنی لمبی کہ ؎

آئی جو ان کی ناک تو آتی چلی گئی   چہرے کے خال و خد کو چھپاتی چلی گئی

ناک سونگھنے ہی کے لیے تھی اور کسی حد تک اب بھی اس کا یہی استعمال سمجھا جاتا ہے ، لیکن اب اس کے اور استعمال بھی نکل آئے ہیں ۔ مثلاً عورتیں ناک میں نتھ ، کیل ، بلاک اور لونگ جیسے زیور پہنتی ہیں ۔

پچھلے پچاس ساٹھ برس سے ناک کا ایک اور بھی مصرف معلوم ہوا ہے ۔ چنانچہ آنکھوں کی بینائی درست کرنے کے لیے جب عینک ایجاد ہوئی تو اُسے ناک پر بٹھا دیا گیا ۔ پرائمری اسکول میں جب کسی استاد کو اپنے شاگرد کے طمانچہ لگانا ہوتا ہے تو وہ سہولت کی خاطر اپنا ہاتھ گال پر اچھی طرح جمانے کے لیے اس کی ناک دوسرے ہاتھ سے پکڑ لیتا ہے ۔

تاریخی ناکوں میں دو ناکیں بہت مشہور ہیں ایک "حیرت ناک" جو کہ ملکہ قلوپطرہ کی تھی کیونکہ اس کے تصور ہی سے لوگ ورطۂ حیرت میں غرق ہو جاتے کہ اگر یہ ایک انچ کا آٹھواں حصہ بھی بڑی ہوتی تو عیسائیوں کی تاریخ اور تمدن مختلف ہوتے ۔ دوسری تاریخی ناک "ہولناک" ہے یہ بھی مصر ہی کی پیداوار ہے اور ابوالہول کے سنگین چہرے پر حضرت مسیحؑ کی پیدائش سے بہت پہلے کی بیٹھی ہوئی ہے ۔

ان دو ناکوں کے علاوہ تاریخ کے چہرے پر کوئی تیسری ناک نہیں ہے ۔ "عبرت ناک" البتہ ہم نے عورت کے چہرے پر دیکھی ہے ۔ ایسی ناک جس کے ہر قدم پر کٹنے کا خطرہ ہوتا ہے "خطرناک" کہلاتی ہے ۔ ۔ "تشویشناک" بہت ہی کم دیکھنے میں آتی ہے ۔ "نم ناک" سے تو ہر ایک کو واسطہ پڑتا ہے ۔ نزلے اور زکام کی حالت میں طربناک ، نم ناک بن جاتی ہے کہ دیکھنے والوں کی اپنی ناک وحشت کے مارے "وحشتناک" ہو جاتی ہے ۔ اور ناکوں کے صرف نام ہی یاد رکھیں ۔ افسوسناک ، غضب ناک ، فریب ناک ، شرم ناک اور تابناک ۔

انجانی مہم

محمد نوید مرزا ۔ لاہور

قسط نمبر ۳

صفدر منصور اور ذیشان آپس میں گہرے دوست ہیں ۔ لاہور جانے کے لئے وہ کراچی اسٹیشن سے ٹرین پر سوار ہوئے دورانِ سفر ایک پُراسرار شخص جس نے نیلا کوٹ زیب تن کیا ہوا تھا ۔ اُن سے باتیں کرنے لگا ۔ دورانِ گفتگو منصور کے ہاتھ میں ذیشان نے ایک پرچی تھمائی جس پر کوڈورڈ کا ایک جُملہ تحریر تھا ۔ باتھ روم میں جاکر منصور نے پرچی دیکھی تو اس پر درج تھا کہ "ھوبڈ ناثواگ ہوام یا" یعنی "یہ آدمی ٹھیک نہیں ہے" منصور ہاتھ دھو کر باتھ روم سے نکلا تو اُسے شدید حیرت ہوئی کیونکہ نیلے کوٹ والا غائب تھا لیکن اس کا کوٹ نشست پر موجود تھا ۔ معلوم ہوا کہ وہ اپنا کوٹ چھوڑ کر سوٹ کیس لے کر روانہ ہوگیا ۔ اچانک منصور نے اپنے سامان کو دیکھا تو پتا چلا کہ نیلے کوٹ والا اپنا سوٹ کیس چھوڑ کر ان کا سوٹ کیس لے گیا ہے ۔ اتنے میں ٹرین کی رفتار بھی کم ہونے لگی ۔ ٹرین تھوڑی دیر کے لئے اسٹیشن پر رُکی اور پھر چل پڑی ۔ جس علاقے سے ٹرین گزر

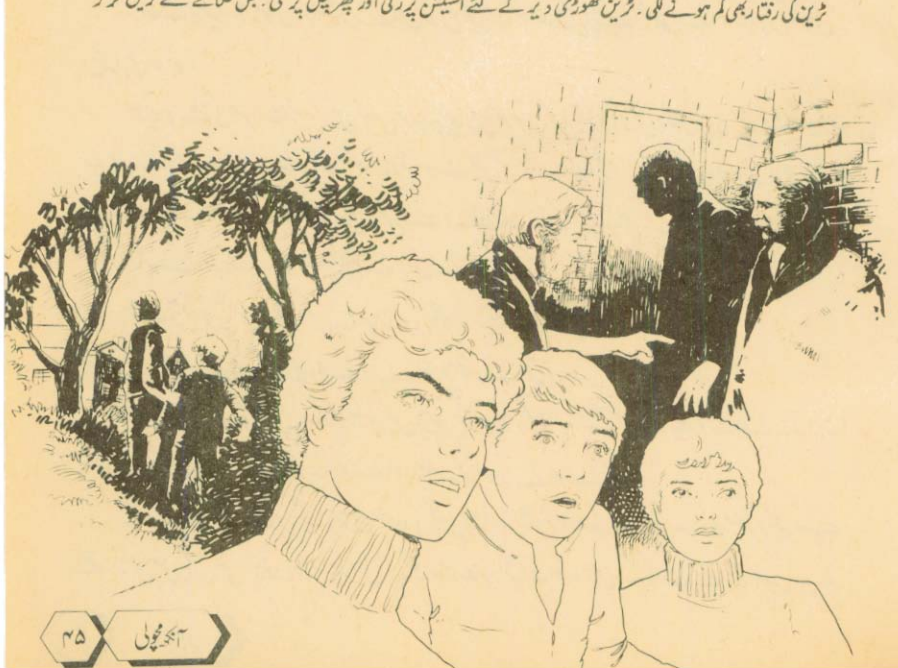

رہی تھی یہ ملٹری کا علاقہ تھا۔ ذیشان نے اپنا شک ظاہر کیا کہ ممکن ہے نیلے کوٹ والا مشتبہ شخص چیکنگ کے خوف سے یہ سوٹ کیس یہاں چھوڑ گیا ہو۔ ابھی وہ یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ پولیس انسپکٹر سامان کو شک بھری نظروں سے دیکھتا ہوا وہاں آپہنچا۔ پولیس انسپکٹر سوٹ کیس اور نیلے کوٹ کو دیکھ کر ٹھٹھکا۔ اور تلاشی لینا چاہی۔ مگر ذیشان نے انسپکٹر کو ایک کارڈ دیتے ہوئے بتایا کہ وہ کرنل رحمان کے پرائیویٹ سیکرٹ سروس کے رکن ہیں۔ اس پر انسپکٹر مطمئن ہو کر چلا گیا۔ رات کو جب اندھیرا چھا گیا تو کھانا کھانے کے بعد ذیشان منصور اور صفدر سوٹ کیس لے کر باتھ روم گئے اور اپنے پاس پہلے سے موجود ماسٹر چابی کے ذریعے اُسے کھولنے کی کوشش کی۔ سوٹ کیس میں سونے کی اینٹیں اور ہیرے جگمگا رہے تھے۔ انہوں نے طے کیا کہ وہ لاہور پہنچ کر خالو کی مدد سے اس سوٹ کیس کی بابت پولیس کو بتائیں گے۔ لاہور پہنچنے کے بعد جب وہ اسٹیشن سے باہر آئے تو ایک ٹیکسی اُن کے قریب آکر رُکی۔ ٹیکسی ڈرائیور نے کہا کہ میں آپ کو آپ کی منزل پر چھوڑ دوں گا۔ تشریف رکھیں۔ ذیشان، منصور اور صفدر ٹیکسی میں بیٹھ گئے، ٹیکسی چل دی۔ تھوڑی دیر بعد جب ٹیکسی شہر کو چھوڑ کر ویرانے کی طرف جانے لگی تو صفدر چلایا... یہ کیا حرکت ہے؟ اس پر ڈرائیور نے اپنے چہرے پر سے سر کے ہوئے ہیٹ کو ہٹا کر اُنہیں دیکھا اور ان پر پستول تان لی... تینوں سہم گئے۔ یہ تو وہی شخص تھا، نیلے کوٹ والا۔ پھر کیا ہُوا، آگے پڑھئے۔

ٹیکسی چلتی رہی تقریباً پانچ منٹ کے سفر کے بعد اُنہیں سڑک کے کنارے دو خوفناک صورت آدمی نظر آئے جو دیکھنے میں ہی غنڈے لگتے تھے نیلے کوٹ والے نے ٹیکسی اُن کے قریب جا کر روکی اور بولا: "جمبو اور گیٹو ان کے ہاتھوں سے اپنا سوٹ کیس اور نیلا کوٹ چھین لو اور سوٹ کیس کھول کر دیکھو کہ پورا مال موجود ہے یا نہیں۔" نیلے کوٹ والے سے چابی لے کر دونوں نے سوٹ کیس کھولا تو اُس میں سونا اور ہیرے جگمگ کر رہے تھے۔

"ارے یہ کیا..." تینوں دوستوں نے اس طرح حیرت کا اظہار کیا جیسے انہوں نے سوٹ کیس کھول کر دیکھا ہی نہ ہو۔

"زیادہ بننے کی ضرورت نہیں میں تمہیں خوب پہچان چکا ہوں کہ تم تینوں کرنل رحمان کی پرائیویٹ سیکرٹ سروس کے ارکان صفدر، ذیشان اور منصور ہو تم سوٹ کیس کا اندر سے جائزہ لے چکے ہو اور جان بوجھ کر انجان بن رہے ہو۔" نیلے کوٹ والے نے اُنہیں غور سے دیکھتے ہوئے کرخت لہجے میں کہا۔

"آپ نے ٹھیک پہچانا۔" ذیشان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اب تو تمہیں باس کے پاس لے جانا ہی ہوگا۔" نیلے کوٹ والا بولا۔

"تم ہمیں پہلے ہی کب چھوڑنے والے تھے" منصور نے لقمہ دیا۔

"جمبو! پستول اس کی کنپٹی پر رکھ کر ٹیکسی میں پیچھے بیٹھ جاؤ۔ گیٹو! تم آگے آجاؤ۔" نیلے کوٹ والے نے اپنا پستول جمبو غنڈے کے حوالے کرتے ہوئے اور منصور کو گھورتے ہوئے کہا۔

تینوں کو ٹیکسی میں بٹھا دیا گیا پستول منصور کی کنپٹی پر تھا۔ ذیشان اور صفدر خاموشی سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ ٹیکسی چل پڑی تھی۔ تینوں دوست اس قسم کے حالات و واقعات اور ماحول کے عادی تھے مگر انھوں نے

آنکھوں ہی آنکھوں میں باتیں کر کے متفقہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ لڑائی نہیں کریں گے بلکہ مجرموں کے ساتھ چلیں گے۔ تاکہ اُن کا اڈّہ دیکھ سکیں۔ اُن کا یہ سفر تقریباً بیس منٹ اور جاری رہا۔ پھر ٹیکسی ایک جھٹکے سے رُکی وہ ایک غیر آباد علاقے میں پہنچ چکے تھے جہاں دُور تک پھیلے ہوئے درختوں کے سلسلے میں صرف چند ایک مکان تھے تینوں مجُرم اُن دوستوں کو پستول کی زد پر ایک طرف لے کر چل پڑے چند منٹ بعد وہ گھنی جھاڑیوں کے درمیان بنی ہوئی عمارت کے پاس پہنچ چکے تھے پھر وہ عمارت کے اندر داخل ہو گئے اور پھر مختلف راہداریوں سے گزرتے ہوئے ایک کمرے کے پاس جا کر رُکے اور دروازے پر دستک دی۔

"کون ہے بھئی ؟" اندر سے آواز آئی۔

"میں ہوں میگھاری صاحب ... آپ کا خادم دھاریوال ..." نیلے کوٹ والے نے کہا اور اُنہیں پہلی بار اُس کا نام معلوم ہُوا۔

"اندر آ جاؤ" آواز آئی۔

دھاریوال اور اُس کے ساتھی اُنہیں اندر لے گئے کمرے میں ایک شخص تاریک شیشوں کی عینک چہرے پر ٹکائے بڑی شان کے ساتھ بیٹھا ہُوا تھا۔

"کیا یہ وہی لوگ ہیں جن کے بارے میں تم نے ٹیلی فون پر بتایا تھا" میگھاری بولا۔

"جی ہاں وہی ہیں ... مال بھی مل چکا ہے" دھاریوال ادب سے بولا۔

"اچھّا ... اب یہ چونکہ ہم سے واقف ہو چکے ہیں اور لوگ بھی بڑے خطرناک ہیں اس لئے فی الحال انہیں کمرے میں بند کر دو۔ ان کا فیصلہ نائب باس اور چیف باس کریں گے" میگھاری نے کہا۔

"اچھا ... یہ خُوب رہی ... کیا تم سے اُونچا بھی کوئی عہدہ ہے ؟" ذیشان نے طنز کرتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا ؟" میگھاری نے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ پہلے تو ہمیں شک تھا مگر اب ہم تینوں جان گئے ہیں کہ تمہارا تعلق بین الاقوامی اسمگلروں کے گروہ سے ہے۔ اور تمہارا یہ منحوس کاروبار کئی سالوں سے جاری ہے تم دوسرے ملکوں سے سونا اور ہیرے جواہرات سمگل کر کے لاتے ہو اور یہاں سے ہیروئن وغیرہ دوسرے ملکوں میں لے جاتے ہو" صفدر نے تیز لہجے میں کہا۔

"کک ... کیا مطلب ... تت ... تم ... بکواس کر رہے ہو" دھاریوال چیخ کر بولا۔

"آرام سے دھاریوال ... انہیں کہنے دو۔ اگر یہ ہمارے کارناموں کو اچھی طرح جان گئے ہیں تو گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہم آج رات ہی نائب باس سے مل کر ان کے بارے میں کوئی فیصلہ کر لیں گے۔

مجھے یقین ہے باس انہیں ایک منٹ بھی زندہ رکھنا پسند نہیں کریں گے" میگھاری خوفناک آواز میں کہتا چلا گیا۔ پھر انہیں ایک تنگ و تاریک کمرے میں بند کر دیا گیا۔ تینوں کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔

"بتاؤ یارو! اب آگے کیا کرنا ہے"۔ منصور نے فکرمند ہوتے ہوئے کہا۔

"پریشانی کی کوئی بات نہیں ہم انشاءاللہ یہاں سے جلد ہی رہائی پالیں گے اور اسمگلروں کے اس بڑے گروہ کو گرفتار بھی کروا دیں گے"۔ ذیشان نے پُرعزم ہو کر کہا۔

"یار! ان کے پیچھے انکل رحمان تو پہلے ہی پڑے ہوئے ہیں اور ملک کی پولیس بھی چوکس ہو کر بیٹھی ہے" صفدر بولا۔

"ٹھیک کہہ رہے ہو تم مگر اب ہمیں رات کا انتظام کرنا ہوگا۔ تاکہ کسی طریقے سے ہم یہاں سے باہر نکلیں اور اس طرح اندھیرے میں غائب ہوں کہ انھیں کانوں کان خبر نہ ہو۔ ذیشان نے کہا۔ اور تینوں اس بات پر متفق ہو گئے۔ وقت گزرتا گیا باتوں کے دوران انھیں احساس ہی نہ ہوا کہ رات کے دس بجنے والے ہیں۔ اس عرصے میں کوئی بھی شخص دروازہ کھول کر اندر نہیں آیا تھا۔ انھیں اب بھوک کا احساس بھی ہو رہا تھا۔ رات کے دس بجے انھوں نے منصوبے کے مطابق عمل کیا۔ صفدر کو مُرغا بننا پڑا اور ذیشان اُس کی کمر پر کھڑا ہوا۔ پھر دُبلے پتلے اور لمبے منصور کے قد سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اُسے ذیشان کے کندھوں پر کھڑا کیا گیا۔ منصور نے روشن دان سے باہر کی طرف دیکھا یہ عمارت کا پچھلا حصہ تھا منصور نے دونوں ہاتھوں سے روشن دان کو پکڑ لیا۔ ذیشان اور صفدر سیدھے زمین پر کھڑے ہو گئے۔ روشن دان تھوڑا سا ٹوٹا ہوا تھا۔ منصور نے اُس میں سے اپنے جسم کو نکالنا شروع کر دیا۔ اگرچہ خلا کافی بڑا تھا۔ مگر وہ بڑی مشکل اور تکلیف سے روشن دان سے نکل پایا۔ اُس کے جسم پر کافی خراشیں آچکی تھیں پھر اُس نے آہستہ سے زمین پر چھلانگ لگائی اور عمارت کے دروازے کی طرف بڑھنے لگا تقریباً پانچ منٹ بعد چھپتا چھپاتا وہ اُس کمرے کے دروازے تک پہنچا جس میں اس وقت ذیشان اور صفدر تھے اور کچھ دیر پہلے وہ خود بھی موجود تھا۔ دروازے کا تالہ لگا ہوا تھا لیکن وہ آتے ہوئے ذیشان سے ماسٹر چابی لے آیا تھا تاکہ ضرورت کے وقت استعمال کر سکے۔ کچھ دیر کوشش کے بعد وہ چابی کے ذریعے دروازہ کھول چکا تھا۔

"باہر آجاؤ شاید سب سو گئے ہیں اس سے پہلے کہ انھیں ہمارے نکلنے کا علم ہو یہاں سے بھاگ چلو"۔ منصور نے سرگوشی کی۔ تینوں دوستوں نے بھاگنا شروع کر دیا۔ چند منٹ میں وہ سڑک پر پہنچ گئے۔ مگر انہوں نے بھاگنے کا عمل جاری رکھا۔ تقریباً ۲۵ منٹ دوڑنے کے بعد اُنھیں ایک طرف سے ایک کار آتی نظر آئی۔ اُنہیں اس علاقے میں یہ پہلی سواری نظر آئی تھی۔ وہ بُری طرح تھک چکے تھے۔ کار کو دیکھ کر

اُن کے چہرے پر ایک نئی تازگی آگئی۔ انہوں نے کار والے کو اشارہ کیا۔ وہ رُک گیا اور بولا: "جی فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں!"

"آپ ہماری حالت دیکھ کر اندازہ کر لیں کہ ہم بدمعاشوں کے چُنگل سے نکل کر آئے ہیں" ذیشان نے ہانپتے ہوئے مختصر ترین الفاظ میں اپنی کہانی سُنائی۔

"اچھا... اچھا... بیٹھیے... میں دراصل آج صبح شہر سے یہاں کم آباد علاقے میں اپنے بیمار رشتے دار کی عیادت کرنے آیا تھا۔ بس اُس کی باتوں میں ایسا اُلجھا کہ رات ہو گئی۔ میں ایک سرکاری افسر ہوں اور احمد کریم میرا نام ہے"۔ وہ شخص بولا۔

تینوں نے مختصر طور پر اپنا تعارف کر دایا۔ احمد کریم اخبارات میں اُن کے کارنامے بڑی دلچسپی سے پڑھتا رہا تھا۔ اس لئے بہت خوش ہُوا اُن کا یہ خوشگوار سفر جاری رہا۔ شہر پہنچ کر احمد کریم نے اُنہیں اُتار دیا۔ تینوں نے اُس کا شکریہ ادا کیا اور ایک طرف بڑھ گئے اب وہ کسی رکشہ یا ٹیکسی کی تلاش میں تھے تاکہ خالو کے گھر پہنچ سکیں۔ چند منٹ بعد اُنہیں ایک رکشہ مل گیا۔ انھوں نے ڈرائیور کو خالو کے گھر کا پتہ بتایا۔ وہ اُس علاقے سے واقف تھا۔ رکشے والے کو کرایہ دے کر جب وہ تینوں دروازے پر پہنچے تو اُسے کھُلا پایا۔ اندر سے تیز تیز بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اُنھیں گڑبڑ کا احساس ہُوا۔ لہٰذا تینوں آہٹ پیدا کئے بغیر گھر میں داخل ہو گئے۔

"تینوں لڑکے جو تمہاری قید سے بھاگے وہ کون تھے؟" پہلی آواز آئی۔

"باس وہ بڑے خطرناک لڑکے ہیں" دوسری آواز آئی۔

"اور کرنل رحمان کی پرائیویٹ سیکرٹ سروس کے ارکان ہیں" تیسری آواز آئی۔

"اوہ... یہ تو بہت بُرا ہُوا... گگ... کرنل رحمان سے میرے گہرے روابط ہیں اور اُن کی سیکرٹ سروس میں میرا بھانجا بھی شامل ہے" پہلی آواز دوبارہ آئی۔ جس میں پریشانی کی جھلک نمایاں تھی۔

تینوں دوست حیرت کے عالم میں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ اندر سے آنے والی آوازیں دھاریوال، میگھاری اور اُن کے خالو کی تھیں۔

"مجھے لگتا ہے کوئی ہماری باتیں سُن رہا ہے۔ اچانک دھاریوال کو اُن کی موجودگی کا احساس ہُوا۔ اس سے پہلے کہ وہ دروازہ کھول کر اُن تینوں کی طرف بڑھتا۔ تینوں تیزی سے گھر سے باہر کی طرف آئے جونہی وہ گھر سے باہر نکلے ٹھٹھک کر رہ گئے۔ انہوں نے سامنے جو منظر دیکھا اُنہیں اُس کی بالکل توقع نہ تھی...

اگلی قسط لکھنے کی دعوت قارئین کو دی جاتی ہے

انجانی مہم کے لکھنے والوں سے چند گزارشات

سلسلے وار ناول "انجانی مہم" کی تیسری قسط کے لئے ہمیں اس بار بھی بہت سی کہانیاں موصول ہوئی ہیں۔ زیادہ تر کہانیاں مار دھاڑ سے بھرپور ہیں۔ لکھنے والوں سے گزارش ہے کہ وہ آئندہ لکھتے ہوئے درج ذیل باتوں کا خیال رکھیں

۱۔ کہانی کی زبان و بیان درست ہونا چاہیے۔
۲۔ کہانی کو دلچسپ اور پُر تجسس ہونا چاہیے۔
۳۔ کہانی میں زیادہ سے زیادہ واقعات ہونے چاہئیں۔
۴۔ کہانی کا اختتام ایسے موڑ پر ہونا چاہیے کہ کہانی اگلی قسط میں بھی آگے بڑھ سکے۔
۵۔ قسط اس طریقے سے ختم ہونا چاہیے کہ اگلی قسط پڑھنے کی خواہش پیدا ہو۔

"انجانی مہم" کی دوسری قسط نوید حمزہ (لاہور) نے لکھی تھی۔ اس مرتبہ بھی انھی کی کہانی سب سے بہترین قرار پائی۔ یہ گویا دوسرے لکھنے والوں کے لئے ایک بڑا چیلنج ہے کہ انھیں اپنی تحریریں زیادہ سے زیادہ محنت کرنی چاہیے کیونکہ ہماری کوشش یہی ہے کہ ہر بار کسی نئے لکھنے والے کو موقع ملے۔ چوتھی دلچسپ اور سنسنی خیز قسط جلدی سے مکمل کیجئے اور ۱۰ نومبر ۱۹۸۹ء سے پہلے ہمیں بھجوا دیجیے۔ تیسری دلچسپ قسط کا انعام ہم نوید حمزہ کو بھیج رہے ہیں اور ساتھ ہی قارئین اور ادارے کی جانب سے انھیں مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

اس بار جن ساتھیوں کی کہانیاں ہمیں ملی ہیں۔ اُن کے نام درج ذیل ہیں۔

۱۔ محمد عادل منہاج، نیو کراچی ۲۔ ضرغام راجہ، سعود آباد کراچی ۳۔ راجہ راشد، گرومندر، کراچی ۴۔ حفصہ صدیقی، سعود آباد کراچی۔ ۵۔ صلاح الدین عباسی، سکھر ۶۔ ماریہ قاضی، حیدرآباد ۷۔ ارم فاطمہ، فیصل آباد ۸۔ محمد سلمان فاروقی، نارتھ ناظم آباد کراچی۔ ۹۔ عرفان کریم جعفر علی، پی آئی بی کالونی کراچی۔ ۱۰۔ افشاں غوری (؟) ۱۱۔ ندرت ثمین، حیدرآباد ۱۲۔ صدف نوشین سعید اختر، حیدرآباد ۱۳۔ ذاکر حبیب میمن (؟) ۱۴۔ حاجی محمد ابراہیم ٹنڈو آدم ۱۵۔ شاھد بخاری، حیدرآباد۔ ۱۶۔ محمد طاھر، لاھور ۱۷۔ شاھد عبداللہ، پشاور ۱۸۔ عابد علی انجم، لطیف آباد ۱۹۔ شازیہ فرحین، ناظم آباد کراچی ۲۰۔ محمد سہیل، حیدرآباد۔ ۲۱۔ اکبر علی انصاری، شیر شاہ کالونی، کراچی ۲۲۔ تجمل عزیز، ٹنڈو محمد خان ۲۳۔ محمد طارق، کراچی ۲۴۔ شبانہ حنیف (؟)

ان ساتھیوں کے نام جن کی کہانیاں مقررہ تاریخ کے بعد موصول ہوئیں

۲۵۔ آصف وقار آصف، واہ کینٹ ۲۶۔ علی گوھر (؟) ۲۷۔ علی رضا عابدی (؟) ۲۸۔ عبداللہ شیخ، حیدرآباد ۲۹۔ خورشید احمد کمال، ھری پور ھزارہ ۳۰۔ شاکر حسین جعفری (؟) ۳۱۔ ساجد حسین جعفری، حیدرآباد۔ ۳۲۔ سجیلا عزیز (سجاول) ۳۳۔ صائمہ کنول، عظمیٰ کنول، حیدرآباد ۳۴۔ ارسلان ظہیر (؟) ۳۵۔ شازیہ رضوانہ (؟) لیاقت حسین، پاپوش نگر، کراچی۔

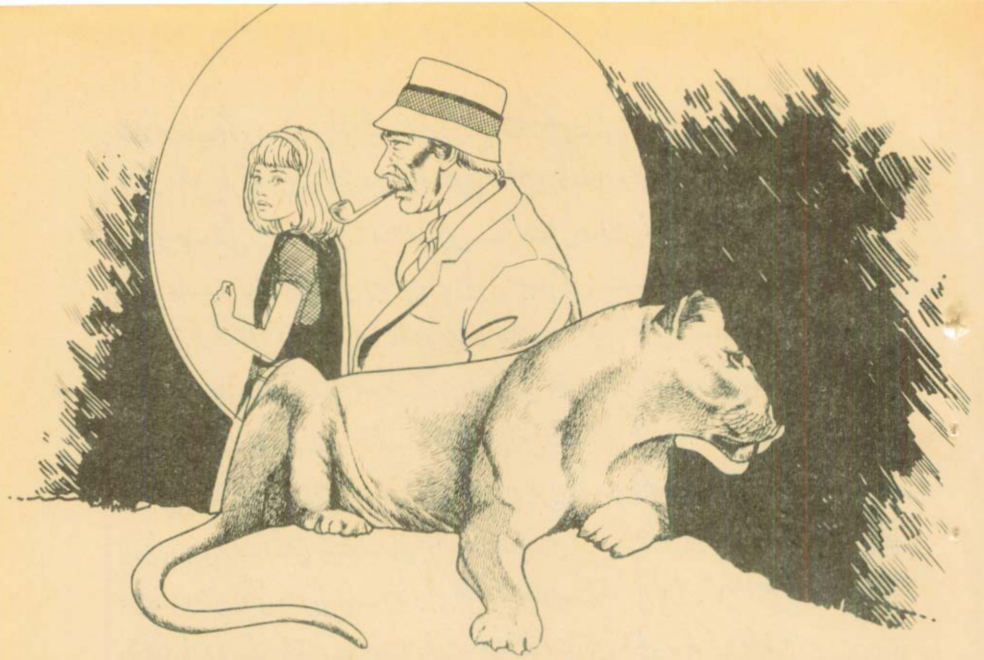

انوکھی شیرنی

رعنا اقبال

آپ نے گھروں میں بلّیاں، طوطے، کُتّے یہاں تک کہ ہرن اور مور تو پلتے دیکھے ہوں گے، لیکن میں آپ
کو جو واقعہ سُنا رہی ہوں وہ ایک پالتو شیرنی کا ہے۔ ہُوا یُوں کہ میرے نانا جان جن کو جنگلوں میں جانے اور شیر کا
شکار کرنے کا بہت شوق تھا ایک مرتبہ وہ شکار کرنے کے لیے جب جنگل گئے تو واپسی میں نہ صرف شکار
کیے ہوئے ہرن لے کر آئے بلکہ اُن کے ساتھ شیر کا ایک نوزائیدہ بچّہ بھی تھا۔ جب نانا جی نے اُسے صوفے
پر لٹایا تو ہم سب نے اُسے غور سے دیکھا وہ بمشکل اٹھارہ انچ کا ہو گا۔ خوبصورت نرم ملائم بلّی جیسا۔

ہم سب نے نانا جان سے پوچھا کہ آپ کو یہ کہاں سے ملا تو نانا جان نے بتایا کہ وہ شکاری گروپ
کے ساتھ پہاڑ کی اونچی نیچی پگڈنڈیوں پر جا رہے تھے کہ برگد کے ایک درخت کے نیچے یہ نوزائیدہ بچّہ اکیلا
پڑا ہوا تھا میں نے سوچا کہ اس کو دُودھ اور خوراک نہ ملی تو یہ مر جائے گا۔ لہٰذا میں اپنے گروپ کو چھوڑ کر اس
بچّے کو لے کر یہاں آ گیا اب اسے پالنا ہم سب کی ذمّے داری ہے۔ نانا جان یہ کہہ کر اس بچّے کے لیے دُودھ
اور گوشت لینے چلے گئے۔ ہم سب لوگ اس بچّے سے بہت جلد مانوس ہو گئے۔ اور بچّہ جو اب ننھی مُنّی شیرنی
بن گئی تھی سارے گھر میں اُچھلتی کودتی رہتی۔ عام طور پر اس کی جائے پناہ ڈرائینگ روم کا بڑا سا صوفہ ہوتا

تھا. ہم سب لوگوں نے اس مُنّی شیرنی کو قبول کر لیا تھا۔ لیکن ہماری نانی جان اُسے کسی طرح قبول کرنے کو تیار نہ تھیں اُن کا کہنا تھا کہ شیر جیسا جانور کبھی پالتو نہیں ہو سکتا۔ یہ بھی ذرا بڑی ہو جانے پر گھر کے لیے خطرہ بن جائے گی۔ لیکن نانا جان کا کہنا تھا کہ میں نے اُسے جس عالم میں اُٹھایا تھا اور اس کی پرورش کی ہے یہ کبھی ہمارے لیے خطرہ نہیں بن سکتی۔ ننّھی شیرنی سب باتوں سے بے خبر مزے سے صوفے میں دھنسی سوتی رہتی اگر گھر کا کوئی فرد اُسے چھیڑتا تو وہ بڑے انداز سے آنکھیں کھول کر اُسے گھورتی اور دوبارہ آنکھیں بند کر کے سو جاتی۔ اُس نے آج تک گھر کے کسی فرد کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ جب اُس کا مُوڈ اچھا ہوتا تو وہ گھر کے بچّوں کے ساتھ خوب کھیلتی۔ میری اُس سے بڑی پکّی دوستی ہو گئی۔ جب میں اُسے چھیڑتی تو وہ بھی اپنی آنکھوں میں شرارت بھر کر مجھے دیکھتی اور پھر اپنے بدن کو مجھ سے قریب کر کے لگ کر بیٹھ جاتی اور یُوں میری طرف دیکھتی جیسے کہہ رہی ہو اب بولو کیسی رہی؟ میں نے اُس کا نام لالی رکھ دیا تھا۔ دیکھتے دیکھتے وہ بڑی ہو گئی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ نانا جان نے اُس کی خوراک کا بڑا اعلیٰ انتظام کر رکھا تھا وقت کی پابندی کے ساتھ اُسے بہترین خوراک کھانے کو ملتی جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ وہ کم عمری میں ہی بڑی اور صحت مند شیرنی نظر آنے لگی۔ نانا جان نے اُس کی سیر و تفریح کا بھی ٹائم ٹیبل مقرر کر رکھا تھا۔ وہ بڑی پابندی سے اُسے پارک میں ٹہلانے کے لیے لے جاتے ابتدا میں تو لوگ اُسے دیکھ کر ڈرتے تھے اور پارک میں اپنے بچّوں کو اکیلا نہ چھوڑتے لیکن جب انہوں نے نانا جان کے اشاروں پر اُسے چلتے ہوئے دیکھا تو وہ حیران بھی ہوئے اور خوش بھی۔ اب وہ بڑی دلچسپی کے ساتھ نانا جی اور شیرنی کو دیکھا کرتے بلکہ بعض بچّے تو اس کا بڑی بے چینی سے انتظار کرتے۔ اب کیونکہ لالی بڑی ہو گئی تھی اس لیے نانی جان کے ڈر اور خوف میں مزید اضافہ ہو گیا تھا لہٰذا اُن کے غصّے کو دیکھتے ہوئے نانا جان نے لالی کو مغرب کے بعد مالی بابا کے کوارٹر میں بھیجنا شروع کر دیا اور صبح ناشتے کے بعد وہ اُسے وہاں سے لے آتے۔ شروع میں تو لالی نے بڑا غصّہ دکھایا۔ اور کسی صورت وہاں سونے پر آمادہ نہ ہوئی پھر کافی دنوں بعد وہ اس بات کی عادی ہو گئی اور مغرب کی اذان ہوتے ہی وہ یوُں مالی بابا کے کوارٹر کی طرف چل دیتی جیسے اپنے بیڈ روم میں جا رہی ہو۔ نانی جان کو اس پر بھی چین نہ تھا وہ اکثر کہتیں۔

"وہ دن دُور نہیں جب لالی، مالی کے بستر پر سوتی نظر آئے گی۔ اور اُس بے چارے کا کہیں نام و نشان نہ ہو گا"

اب لالی چھ ماہ کی ہو چکی تھی اور اُسے صحیح طور پر غرّانا اور غصّہ کرنا آ گیا تھا۔ اس لیے اب اُسے زنجیر ڈال کر رکھا جاتا تھا۔ اب وہ مالی بابا کو بڑی خونخوار نظروں سے دیکھنے لگی تھی اس سے گھر والوں کے شبہے کو اور تقویت ملی۔ اور اُن کا اصرار بڑھا کہ اب لالی کو گھر سے باہر نکال دینا چاہیے۔ ورنہ کوئی بڑا نقصان ضرور ہو جائے گا۔

بہت سوچ بچار کرنے کے بعد نانا جی نے اُسے چڑیا گھر کے حوالے کرنے کا فیصلہ کر لیا لیکن میں جانتی تھی کہ نانا جی نے یہ فیصلہ صرف گھر والوں کی خاطر کیا ہے ورنہ وہ لالی سے اتنی ہی محبّت کرتے تھے جتنی ہم سب بچّوں سے۔ اِدھر میرا بھی رو رو کر بُرا حال تھا۔ کیونکہ ہر وقت اُس کے ساتھ رہنے کی جیسے مجھے عادت پڑ گئی تھی اور پھر ایک دن ایسا آیا کہ جب نانا جی اور میں لالی کو لے کر قریبی چڑیا گھر گئے وہاں کے حکّام سے بات چیت کی اور ان کو بتایا کہ یہ ہماری پالتو شیرنی ہے جسے ہم آپ کے حوالے کرنا چاہتے ہیں۔ چڑیا گھر کے حکّام یہ سُن کر بہت خوش ہوئے اور ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ پھر نانا جی نے گھوم پھر کر سارے چڑیا گھر کا جائزہ لیا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ انہوں نے کس پیار سے لالی کو پالا ہے اور وہ کیسی جگہ رہنا پسند کرتی ہے۔ کافی دیر کے بعد انہیں ایک مناسب پنجرہ نظر آیا جس میں لالی کو رکھا جا سکتا تھا۔ نانا جی نے انتظامیہ کو لالی کی عادات اور خوراک وغیرہ کے بارے میں تفصیل سے بتایا وہ چاہتے تھے کہ اُن کی لالی کو چڑیا گھر میں کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔ حکّام نے نانا جی سے وعدہ کیا کہ لالی کا ہر طرح خیال رکھا جائے گا آخر میں اور نانا جی لالی کو لے کر اُس کے پنجرے کی طرف آئے اور اُسے اندر پہنچانے کی کوشش کرنے لگے لیکن لالی شاید سب کچھ سمجھ چکی تھی وہ کسی طرح اندر جانے کو تیار نہ تھی آخر بڑی مشکل سے اُسے کچھ لوگوں کی مدد سے جال کے اندر پہنچایا گیا۔ لالی کا شور حد سے زیادہ بڑھ چکا تھا وہ بُری طرح سے غرّا رہی تھی اور اِدھر اُدھر دوڑ رہی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ دروازہ کھول دیا جائے۔ نانا جان اور میں نے اُسے بہت سمجھانے کی کوشش کی نانا جان نے دونوں ہاتھ پنجرے کے اندر ڈال دیے اور لالی نے شدید غصّے میں ہونے کے باوجود ان کے ہاتھوں میں اپنا سر رکھ دیا۔ یوں جیسے رو رہی ہو اب نانا جی سے بھی برداشت نہ ہُوا اور وہ بھی اُس کے سر پہ ہاتھ پھیر کر رونے لگے لالی اُن کے ہاتھ بُری طرح سے چاٹ رہی تھی جیسے خوشامد کر رہی ہو کہ مجھے یہاں سے نکال لو میں تمہارے ساتھ ہی جاؤں گی۔ میری بھی آنکھیں بھری ہوئی تھیں مجھے بہت رونا آ رہا تھا، لیکن میں نانا جان کی وجہ سے خاموش تھی میں انھیں مزید دُکھی نہیں کر سکتی تھی۔ کافی دیر تک لالی اسی طرح نانا جان کے ہاتھوں میں منہ رکھے کھڑی رہی اور نانا جان روتے رہے چڑیا گھر کے حکّام بڑی حیرت سے سارا منظر دیکھ رہے تھے آخر نانا جان نے الوداعی انداز میں اُس کا سر تھپتھپایا اور میرا ہاتھ پکڑ کر وہاں سے چل دیے۔ میں نے آنسو بھری آنکھوں سے پیچھے مُڑ کر دیکھا لالی بھی ہمیں دیکھ رہی تھی اُس کی بھی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ہم دونوں بہت اُداس اُداس گھر واپس آ گئے۔ نانی بڑی مطمئن تھیں۔ جیسے انھوں نے کسی بلا سے نجات پالی ہو۔

تقریباً چھ ماہ تک نانا جی دوبارہ اس چڑیا گھر میں نہ گئے۔ حالانکہ کئی مرتبہ میں نے اُن سے وہاں چلنے

کے لیے کہا لیکن اُن کا خیال تھا کہ لالی پوری طرح وہاں کے ماحول سے مانوس ہو جائے پھر ہم اس سے ملنے جائیں گے تاکہ وہ دوبارہ اُداس نہ ہو آخر کچھ عرصے بعد میں نے انھیں اس بات پر مجبور کر ہی دیا کہ ہم دونوں چڑیا گھر جاکر لالی سے مل آئیں۔ جب ہم چڑیا گھر گئے تو ماحول کافی حد تک بدلا ہوا نظر آیا۔ پنجرے بھی تبدیل ہو گئے تھے۔ اور لوگ بھی وہ نہ تھے جن کے حوالے ہم نے اپنی لالی کی تھی۔ خیر ہم دونوں ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہاں پہنچ ہی گئے۔ ایک پنجرے میں لالی موجود تھی لیکن اس کے ساتھ ہی کے جال میں ایک شیر بھی موجود تھا۔ دوسری بات جو شدّت سے میں نے محسوس کی وہ یہ کہ لالی اب کچھ کمزور نظر آرہی تھی۔ ہمیں دیکھ کر وہ فوراً سامنے آ گئی اور نانا جی نے جیسے ہی اپنے دونوں ہاتھ سلاخوں سے اندر ڈالے اُس نے اپنا سر نانا جی کے ہاتھوں رکھ دیا اور جلدی جلدی ان کی ہتھیلیاں چاٹنے لگی۔ کبھی وہ اپنا سر اُن کے ہاتھوں سے رگڑتی جیسے دوبارہ ملنے پر خوش ہو رہی ہو۔ لیکن عجیب بات یہ ہوئی کہ اس کے ساتھ والا شیر زور زور سے دھاڑنے لگا۔ لالی یہ شور سُن کر سہم گئی اور نانا جی کے ہاتھوں کو چھوڑ کر ذرا فاصلے پر جاکر کھڑی ہو گئی۔ نانا جی اور میں نے اُس کو حیرت سے دیکھا۔ اتنے میں شیر خاموش ہو کر ایک طرف کو چلا گیا۔ نانا جی نے دوبارہ لالی کو پُچکارا اور کہا: "کیوں لالی کیسی ہو؟"

اور لالی فوراً دوڑتی ہوئی دوبارہ نانا جی کے بازوؤں میں آ گئی ابھی نانا جی اور میں لالی سے باتیں کر ہی رہے تھے کہ وہی شیر ایک بار پھر زور سے دھاڑا لیکن اب کے اس کی آواز بہت اونچی تھی اور اس کا غصّہ صاف محسوس کیا جاسکتا تھا۔ شیر کی اونچی آواز سُن کر انتظامیہ کے دو تین افراد اس پنجرے کے قریب آئے اور جب انھوں نے ہمیں یہاں کھڑے دیکھا تو بولے "آپ یہاں کیا کر رہے ہیں۔ آپ کو معلوم نہیں کہ یہ جوڑا نہایت خوفناک اور غصّہ ور ہے۔ یہ آپ کو نقصان بھی پہنچا سکتا ہے" اُس پر نانا جی نے کہا۔

"میری لالی نے کبھی کسی غیر کو کچھ نہیں کہا تو مجھے کیسے نقصان پہنچا سکتی ہے۔ میں نے تو اسے اپنے بچّوں کی طرح پالا ہے۔" "کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ آپ نے اس شیرنی کو بچّوں کی طرح پالا ہے؟"

انتظامیہ کے ایک رُکن نے حیران لہجے میں کہا "ہاں ہاں اس شیرنی کو یہ میری لالی ہے۔"

اب نانا جان بھی بھڑک اُٹھے تھے۔ وہ پھر بولے۔

"آپ میں سے کسی کو وہ دن یاد نہیں جب میں اسے یہاں لے کر آیا تھا اُس وقت تو آپ لوگوں نے خوشی خوشی لالی کو یہاں رکھ لیا تھا۔ اور اب مجھے بھی نہیں پہچان پا رہے ہیں آپ؟"

تب وہ سب آپس میں آہستہ آہستہ کچھ باتیں کرنے لگے۔ پھر اُن میں سے ایک شخص وہاں سے چلا گیا۔ دوسرے آدمی نے نانا جی سے کہا۔

"آپ کچھ دیر یہاں ٹھہریے میں نے ایک صاحب کو یہاں بلوایا ہے۔"

نانا جی اور میں وہیں ایک طرف کو کھڑے ہو گئے۔ میری نظریں اب بھی لالی پر تھیں وہ مجھے غور سے دیکھ رہی تھی۔ مجھے اُس کی کمزور حالت پر بہت افسوس ہو رہا تھا۔ اور انتظامیہ پر بھی سخت غصہ آ رہا تھا کہ انھوں نے اُس کا خیال نہیں رکھا۔ اتنے میں وہی آدمی دوسرے دو آدمیوں کے ساتھ آتا دکھائی دیا میں نے اُنہیں پہچان لیا یہ وہی آدمی تھے۔ جنھوں نے ہماری لالی کو پنجرے میں بند کیا تھا اور سارے معاملات طے کیے تھے۔ انھوں نے نانا جی سے سلام دُعا کی ہاتھ ملایا۔ نانا جی نے اُن سے پوچھا۔

"یہ لالی اتنی کمزور کیوں ہو گئی ہے کیا یہ ابھی تک ہم لوگوں کو نہیں بھُولی؟"

"نہیں یہ بات نہیں ہے دراصل آپ غلط سمجھ رہے ہیں یہ آپ کی لالی نہیں ہے۔" اُس آدمی نے جواب دیا۔

"کیا؟ کیا کہا آپ نے یہ لالی نہیں ہے؟ پھر یہ کون ہے؟" نانا جی نے حیرت سے پوچھا۔

"اصل میں آپ کی لالی تو یہاں آنے کے پندرہ روز کے بعد ہی مر گئی تھی۔ اُس نے کھانا پینا بالکل چھوڑ دیا تھا۔ وہ آپ سے بہت محبّت کرتی تھی اس لیے جدائی نہ برداشت کر سکی حالانکہ اُسے چند روز بعد اپنے ماں باپ بھی مِل گئے تھے۔" اُس آدمی نے تفصیل سے بتایا۔

نانا جان عجیب کیفیت میں مبتلا تھے اُنھیں لالی کے مرنے کا غم تو تھا ہی لیکن وہ کچھ حیران بھی دکھائی دیتے تھے آخر انہوں نے کہا۔

"اگر یہ لالی نہیں ہے تو پھر اس نے میرے ہاتھ کیوں چاٹے میری آواز پر بھاگ کر میرے بازوؤں میں کیوں آ گئی جبکہ ان کا کہنا ہے کہ یہ بہت خونخوار اور غصّہ ور ہے۔"

"جی ہاں اب بات میری سمجھ میں آ گئی ہے میں آپ کو تفصیل سے بتاتا ہوں۔" اُس آدمی نے نانا جی کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"اصل میں آپ نے جس نوزائیدہ شیرنی کو پالا پوسا، اور پھر ہمارے پاس چھوڑ گئے تھے وہ اسی جوڑے کی بچّی تھی۔" وہ سانس لینے کے لیے رُکا تو نانا جی بول پڑے۔

"یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں اور اگر یہ درست بھی ہے تو اس شیرنی کا میرے ساتھ یہ رویّہ کیوں اُس نے مجھے کوئی نقصان کیوں نہ پہنچایا؟"

"یہی میں آپ کو بتانے جا رہا ہوں وہ بچّی یعنی آپ کی لالی اپنے ماں باپ سے بچھڑ گئی تھی۔ وہ تو بہت اچھی طرح پرورش پا گئی لیکن یہ ماں باپ اپنی بچّی کی جُدائی برداشت کرتے کرتے تھک گئے۔ اصل میں آپ نے جب اس بچّی کو اُٹھا کر چلنا شروع کیا تھا۔ تو ان دونوں نے آپ کو دیکھا تھا۔ اب چونکہ یہ ماں ہے۔

اوراس نے آپ کو پہچان لیا ہے تو شکریے کے طور پر اُس نے آپ سے وہی سلُوک کیا جو اُس کی بیٹی کا آپ کے ساتھ تھا۔ اور جہاں تک شیر کے دھاڑنے کا سوال ہے تو وہ چونکہ نر ہے اور مامتا کے جذبات سے آشنا نہیں اس لیے اُس نے اُس منفی رویّے کا اظہار کیا جیسے آپ کو وہ اپنی بچّی کا قاتل سمجھتا ہو۔"

اُس آدمی نے بڑی تفصیل سے نانا جی کو سمجھایا اور جیسے نانا جی کی سمجھ میں ساری بات آگئی اُنھیں لالی کے مرنے کا بہت افسوس تھا پھر بھی اُنھوں نے شیر کے اُس جوڑے کے بارے میں پوچھا کہ یہ اُنھیں کہاں سے ملا۔ اُس آدمی نے جواب دیا۔

"ہم لوگ تو چونکہ چڑیا گھر کی دیکھ بھال اور دیگر امُور کی نگرانی کرتے ہیں اس لیے مختلف کاموں سے آئے دن جنگل میں جاتے رہتے ہیں اس لیے اب سے چھ ماہ قبل جب کہ لالی کو یہاں آئے ہوئے صرف چند روز ہی ہوئے تھے ہم کسی کام سے جنگل گئے تو وہاں اس جوڑے کو بالکل نڈھال حالت میں درخت کے نیچے پڑا دیکھا تو اُٹھاکر یہاں لے آئے جیسے ہی ہم لوگ لالی کے پنجرے کے سامنے سے گزرے اس شیرنی نے اُس کی طرف دوڑنا اور چیخنا شروع کر دیا۔ کچھ اسی قسم کی حرکات لالی بھی کر رہی تھی۔ ہم نے ویسے ہی لالی کے پنجرے کا تالا کھول دیا یہ دونوں خود بخود اندر چلے گئے اور لالی سے لپٹ گئے دونوں لالی کو چاٹ رہے تھے اور جسم رگڑ رہے تھے جیسے اُسے پیار کر رہے ہوں یہ سب دیکھ کر ہمیں آپ کی باتیں یاد آئیں جو آپ نے لالی کو یہاں چھوڑتے وقت ہمیں بتائی تھیں۔ لہٰذا ہم سمجھ گئے کہ لالی اُسی کی بیٹی ہے تب سے یہ تینوں ایک ساتھ ہی رہتے تھے لیکن ماں باپ کے ملنے کے باوجود لالی آپ کو نہیں بھُولی اور کھانا پینا چھوڑ دیا۔ یہاں تک کہ وہ پندرہ دن بعد مَر گئی، لیکن ہمیں یہ حیرت ہے کہ اس شیرنی نے آپ کو پہچانا خوب!"

اُس آدمی نے اپنی طویل بات ختم کی اب نانا جی بھی مطمئن ہو گئے وہ بولے۔

"آپ لوگ میرے ساتھ آئیں میں آپ کو دکھاتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گئے اور کٹہرے کے پاس جاکر اپنے دونوں ہاتھ سلاخوں سے اندر ڈال دیے۔ شیرنی بہت سکون کے ساتھ آہستہ آہستہ اُن کے قریب آئی اور ہاتھوں میں سر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ جیسے اُسے سکون مل رہا ہو۔ نانا جی کے ساتھ کھڑے ہوئے لوگ بڑی حیرت سے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے اور نانا جی کے چہرے پر شفقت بھری مُسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ جب ہم گھر واپس آئے تو نانا جان نے سب کو تفصیل سے چڑیا گھر میں پیش آنے والا واقعہ سُنایا۔

میں نے دیکھا نانی جان دوپٹّے سے اپنی آنکھیں خُشک کر رہی تھیں، میں نے سوچا وہ بھی تو آخر ماں ہیں ... (رسکن بانڈ کی ایک انگریزی کہانی سے ماخوذ)

میں نے سونگھ کر اِس کو بات یہ سمجھ لی ہے
یہ شریر زرافہ انتہائی نقلی ہے

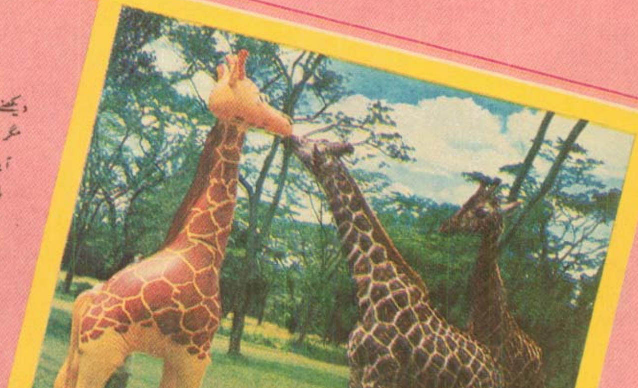

یہ زرافہ دُور سے دیکھنے پر بالکل اصلی لگتا تھا۔ مگر میں جب اس کے قریب آیا تو معلوم ہوا کہ یہ تو بالکل نقلی ہے۔ چیزوں اور لوگوں کے اصلی اور نقلی پن کو جاننے کے لئے ان کا قریب سے مشاہدہ کیجئے۔

یہ اصلی زرافے کی گردن نہیں۔ بلکہ تیل کے کنویں سے تیل نکالنے والا پمپ ہے۔ سعودی عرب کے صحرا میں تیل نکالنے والی ایک کمپنی کے کارکنوں نے کئی کنووں پر مختلف جانوروں کی شکلوں والے پمپ لگا رکھے ہیں۔ کس لئے؟ تاکہ صحرا کے بے رنگ ماحول میں خود کو فطرت سے قریب محسوس کر سکیں۔ اسے آپ جنگل میں چھوٹا سا منگل کہہ سکتے ہیں۔

مہوش شکیل

آنکھیں ہیں کہ ہیرے کی چمکتی ہوئی کنیاں

رات کے دس بج چکے تھے. جنگل میں طرح طرح کے جانوروں کی آوازیں گونج کر فضا کو پُراسرار بنا رہی تھیں۔ اسکاؤٹنگ کیمپ میں شامل اکثر بچے جلتی ہوئی لکڑیوں کے اِردگرد بیٹھے ہوئے اپنے کیمپ انچارج سے بھوتوں کی کہانی سُن رہے تھے۔ اُن کے ذہن کہانی کی بھول بھلیوں میں کھوئے ہوئے تھے اور دل انجانے خوف سے دھیرے دھیرے دھڑک رہے تھے. یکایک اُن میں سے ایک بچے کی نظر سامنے کی جانب اُٹھی تو اُس کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ اُس نے دیکھا کہ سامنے کی جھاڑیوں سے دو انگارہ سی آنکھیں اُن کی طرف گھور رہی ہیں۔

"ارے، وہ دیکھو! بھالو ہمیں گھور رہا ہے" بچہ سرگوشی میں بولا. سب بچے اُن آنکھوں کی طرف دیکھنے لگے۔

"مجھے تو لگتا ہے یہ بھیڑیا ہے" کسی دوسرے نے کہا۔

"ممکن ہے یہ کوئی بھُوت ہو" کسی ڈرپوک بچے نے سہمے ہوئے لہجے میں تبصرہ کیا. کیمپ کے لیڈر نے جلدی سے اپنی ٹارچ کی روشنی اُدھر پھینکی تو سب کھسیا کر ہنسنے لگے. سامنے ان کا ایک کلاس فیلو اپنی پالتو بلّی کو گود میں لئے کھڑی تھی. اس بلّی کی آنکھیں اندھیرے میں چھوٹے چھوٹے انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔

① رات کو جب میری آنکھیں روشنی سے جھلملاتی ہیں تو لگتا ہے کہ جیسے میں کوئی چشمہ لگائے پھر رہا ہوں

② کالی بلّی کی آنکھوں میں شاید چھوٹے بلب لگے ہیں۔

③ ہری ہری ان آنکھوں سے جنگلی بلّی جانے کس کو گھور رہی ہے؟

بلّی کے علاوہ جنوبی امریکہ میں مگرمچھ کی طرح کا ایک رینگنے والا جانور پایا جاتا ہے۔ اُس کی آنکھیں بھی اندھیرے میں چمکتی ہیں۔ اگر آپ دُور سے اُس کی آنکھوں کو دیکھیں تو سمجھیں گے کہ اُس نے کوئی چشمہ لگایا ہُوا ہے۔ برابر کے صفحہ پر آپ اس جانور کو دیکھ سکتے ہیں۔

آپ نے یقیناً جنگلی بلّی نہیں دیکھی ہوگی اور آپ دیکھ بھی کیسے سکتے ہیں۔ کیونکہ جنگلی بلّی ایشیا اور افریقہ کے جنگلوں میں پائی جاتی ہے۔ اُس کے چھوٹے بچّوں کا وزن بیس پونڈ سے کم ہوتا ہے۔ یہ رات کے اندھیرے میں شکار کھیلتی ہے۔ ان بلّیوں کی آنکھیں سبزی مائل ہوتی ہیں اور رات کو خُوب چمکتی ہیں۔ برابر والے صفحے پر اس طرح کی ایک بلّی آپ کی توجّہ چاہتی ہے۔

جانوروں کی طرح بعض انسانوں کی آنکھیں بھی چمکتی ہیں۔ جانوروں اور انسانوں کی آنکھوں کی چمک میں ایک فرق ہے، جانوروں کی آنکھیں روشنی سے چمکتی ہیں اور انسانوں کی ذہانت اور خوشی سے۔ اگر امّی ابّو سے کسی بات پر ڈانٹ کھا کر نہ بیٹھے ہوں تو ذرا آئینہ دیکھ لیجئے۔

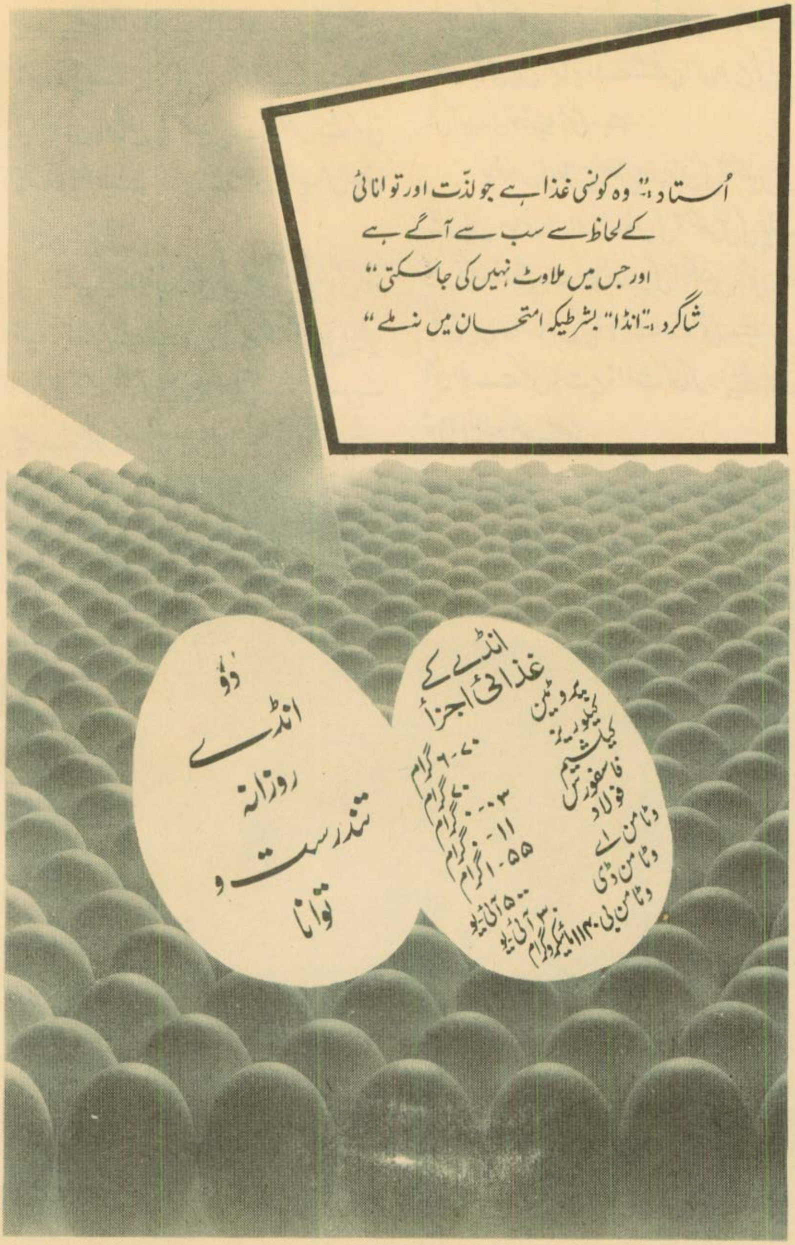

اُستاد :۔" وہ کونسی غذا ہے جو لذّت اور توانائی
کے لحاظ سے سب سے آگے ہے
اور جس میں ملاوٹ نہیں کی جاسکتی "
شاگرد :۔"انڈا" بشرطیکہ امتحان میں نہ ملے "
انڈے کے غذائی اجزا
پروٹین
لیپوریڈز
کیلشیم
فاسفورس
فولاد
وٹامن اے
وٹامن ڈی
وٹامن بی۔١١٣٠ مائیکروگرام
٦.٧٠ گرام
٠.٧ گرام
٠.٠٣ گرام
٠.١١ گرام
١.٥٥ گرام
٥٠٠ آئی یو
٣ آئی یو
دو انڈے روزانہ
تندرست و توانا

ایک نابینا ہَوا باز کی زندگی کا ناقابلِ یقین موڑ

سیّد خورشید عالم

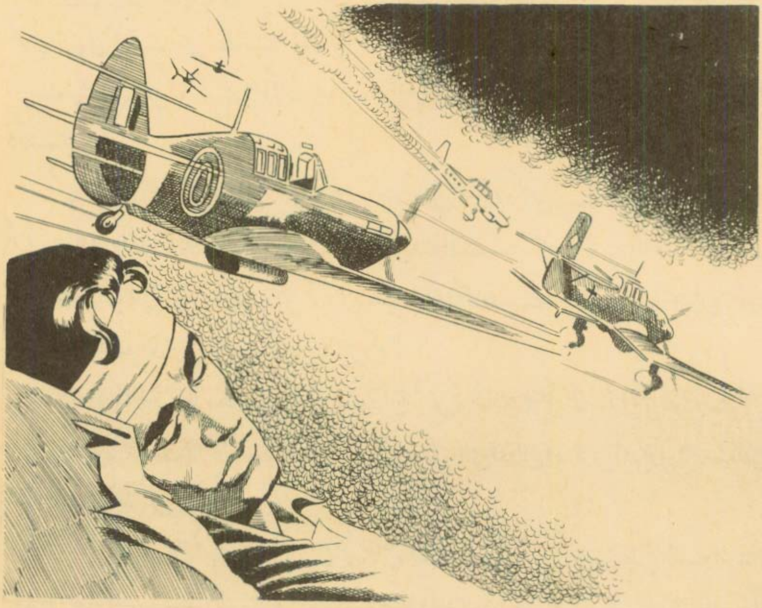

اب میں دیکھ سکتا ہوں

وہ ایک نابینا ہوا باز تھا۔ بظاہر کتنا عجیب سا نظر آتا ہے کہ کوئی نابینا بھی ہَوا باز ہو سکتا ہے اور وہ بھی فضائیہ کا۔ مگر حقیقت یہی تھی کہ جان ہاورڈ گریفن John Howard Griffin امریکی فضائیہ کا ایک ماہر نوجوان ہوا باز تھا۔ یہ دوسری جنگِ عظیم کا زمانہ تھا۔ ایک روز قسمت کی دیوی

اُس پر مہربان نہ تھی۔ ایک مُہم پر جانے کے لیے وہ جُونہی رَن وے پر کھڑے اپنے جہاز کی طرف دوڑ رہا تھا تو اُس کے بالکل قریب ایک بَم آکر گرا۔ جان کو زخم تو معمولی آئے مگر بَم کے شدید دھماکے سے اُس کی بینائی ضائع ہوگئی۔ فضائیہ سے اُس کی چھٹّی ہوگئی۔ اور وہ آنکھوں میں اندھیرا لیے گھر آگیا۔ گھر پر ماں کی شفقت اُس کے لیے سہارا بنی۔ جس گھر میں وہ بے تکلّفی سے چل پھر سکتا تھا اب وہ اس کے لیے اجنبی بَن گیا۔ اُسے پھونک پھونک کر قدم اُٹھانا پڑتے تھے کہ کہیں کسی چیز سے ٹکرا کر چوٹ نہ لگ جائے۔

"کیا میں کبھی بھی اس دُنیا کی رنگینی کو نہیں دیکھ سکوں گا ؟" وہ کبھی اپنے آپ سے سوال کر بیٹھتا مگر اُسے اِن سوالوں کا جواب کون دیتا۔ آہستہ آہستہ وہ حالات سے سمجھوتہ کرنے لگا تھا۔ اُس نے یہ سوچ کر صبر کر لیا کہ چلو چند سال ہی سہی مگر اُس نے دنیا کو دیکھا تو ہے۔ ورنہ ایسے لوگ بھی ہیں جنھوں نے دُنیا کو صرف سُنا ہی ہوتا ہے مگر دیکھا نہیں ہوتا۔

۱۹۵۲ء کا سال جان کے لیے خوشی لے کر آیا۔ اُس کی شادی ہو چکی تھی۔ اُس کی بیوی نے بھی ہر طرح جان کی شخصیت کو سنوارنے میں اُس کی بڑی مدد کی۔ اِسی دوران وہ سوسن اور جونی نام کے دو پھول سے بچّوں کا باپ بھی بن گیا۔

"میری ایک ہی خواہش ہے کہ میں اپنی بیٹی سوسن اور بیٹے جونی کو دیکھ سکوں۔" جان بڑے حسرت آمیز انداز میں کہتا۔ دن گزرتے گئے۔ بالآخر ۹ جنوری، ۱۹۵۷ء کو اس کی زندگی میں سب سے بڑا انقلاب آگیا۔ اس کی بینائی بحال ہونے لگی تھی۔ اس کو آس پاس کا منظر دھُندلا دُھندلا نظر آنے لگا تھا۔ اُس دِن جان نے پہلی بار اپنی بیوی اور بچّوں کو بڑے غور سے دیکھا۔ اُس نے کئی برس بعد اپنی ماں کو دیکھا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ واقعہ اپنی طرز کا انوکھا واقعہ تھا۔ وہ راتوں رات مشہور ہوگیا۔ اخبارات ورسائل کے رپورٹر اُس کا انٹرویو کرنے کے لیے اُس کے آگے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ اس کے بارے میں خبریں چھپ رہی تھیں۔ ذیل میں اس کی یادداشتیں پیش کی جارہی ہیں جو اُس نے اپنی بینائی کی بحالی کے بعد مرتب کی تھیں۔

<u>اتوار۔ ۱۳ جنوری ۱۹۵۷ء</u>۔ آج سے چار روز قبل بُدھ کے دن مجھے ایسا محسوس ہُوا جیسے میری آنکھوں میں سُرخ سُرخ روشنی گردش کرنے لگی ہے۔ مجھے لگا جیسے میں دروازے کو دیکھ سکتا ہُوں۔ میرے سَر اور آنکھوں میں بڑا شدید درد ہو رہا تھا۔ مگر خوشی کے مارے میرا دِل بلّیوں اُچھل رہا تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ میں ناچنے لگوں۔ اس وقت میں اپنے ورکشاپ میں تھا۔ میں نے اِدھر

اُدھر دیکھا تو سامنے میز پر فون رکھا نظر آیا۔ میں فون کی طرف لپکا اور گھر کا نمبر ڈائل کیا۔ فون میری بیوی نے اُٹھایا۔

"کیا بات ہے جان تم ٹھیک تو ہونا؟" اُس نے پوچھا۔

"مجھے... میرا خیال ہے..." آنسوؤں سے میرا چہرہ تر ہو گیا۔

"مجھے نظر آنے لگا ہے... ہاں میں دیکھ سکتا ہوں"۔

"ٹھیک ہے تم فوراً لیٹ جاؤ۔ میں ڈاکٹر کو لے کر ابھی آ رہی ہوں"۔

تھوڑی دیر بعد میری بیوی ڈاکٹر کلیٹن کو لے کر آ گئی۔ میری بیوی کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔ میرے دونوں بچے بھی ساتھ تھے۔

"تم اُن خوش نصیب افراد میں سے ایک ہو جن کی بینائی خود بخود بحال ہوئی ہے"۔ ڈاکٹر کلیٹن نے مجھے تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ میں نے آج پہلی بار اپنی بیوی کو غور سے دیکھا۔ میری بیٹی سوسن اور بیٹا جونی بھی اُس کے ساتھ تھے۔ گو کہ میرے آس پاس کا منظر بالکل واضح تو نہ تھا تاہم مجھے غور کرنے پر ہر چیز نظر آنے لگی تھی۔ شام کو میں ڈاکٹر کلیٹن کی کلینک میں تھا۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ مجھے کم از کم ایک رات ڈاکٹروں کی نگرانی میں رہنا چاہیے۔ مجھے مختلف اقسام کے انجکشن لگائے گئے۔ رات ہونے کو آئی مگر نیند میری آنکھوں سے بہت دُور تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں دوبارہ سو کر اُٹھنے پر میں پھر نابینا تو نہ ہو جاؤں گا۔ میں خاصا تھک گیا تھا۔ مختلف اخبارات کے رپورٹروں اور فوٹو گرافروں نے دن میں کئی گھنٹے مجھے گھیرے رکھا۔ مختلف زاویوں سے میری تصویریں بنائی گئیں۔ میرے تاثرات معلوم کیے گئے۔

پیر۔ ۱۴ر جنوری ۱۹۵۷ء۔ مجھے ڈاکٹر کلیٹن کے مشورے سے سینٹ کارل بھیج دیا گیا ہے۔ میرے اعصاب خاصے تنے ہوئے ہیں۔ یہاں کے نگران فادر پیٹرک ہیں جن سے گفتگو کر کے کوئی بھی شخص اپنے غم بھول سکتا ہے۔ رات ہو چکی ہے۔ فادر پیٹرک مجھے شب بخیر کہہ کر اپنے کمرے کی طرف جا چکے ہیں۔

منگل۔ ۱۵ر جنوری ۱۹۵۷ء۔ بہت سی چیزیں جو پہلے دُھند میں لپٹی ہوئی تھیں آہستہ آہستہ واضح ہوتی جا رہی ہیں۔ فادر پیٹرک نے مصوّری کی ایک کتاب لا کر دی۔ مجھے کتاب کا ہر صفحہ اور تصویر بڑی اچھی طرح نظر آئی۔ مجھے اپنا گھر، بیوی بچے اور اماں یاد آ رہے ہیں۔ واقعی یہ تو ہم سب کے لیے بڑی خوشی کا موقع تھا۔

جمعرات ۔ ۱۷ر جنوری ۱۹۵۷ء یہاں کے ماحول میں جو سکون ہے اُس کا میرے اعصاب پر خاصا مُثبت اثر مرتب ہُوا ہے ۔ میں نے مستقبل کی منصوبہ بندی بھی کی ہے ۔ اور کافی دیر تک لان میں پھُولوں کو دیکھا اور محسوس کیا ہے ، پھُول جو قدرت کا بڑا حسین عطیہ ہیں بالکل میری سوسن اور جونی کی طرح ۔

پیر ۔ ۲۱ر جنوری ۱۹۵۷ء ۔ مجھے کئی ڈاکٹروں کے ایک پینل نے معائنے کے بعد نظر کا چشمہ لگانے کی ہدایت کی ہے ۔ میں اپنے گھر آچکا ہوں ۔ میرے بچّے مجھ سے بار بار لپٹے جا رہے ہیں ۔ ڈاکٹروں نے مجھے مکمّل آرام کی ہدایت کی ہے ۔ اُن کا کہنا ہے کہ زیادہ سے زیادہ آرام ہی مجھے فائدہ دے سکتا ہے ۔

ہفتہ ۔ ۲۶ر جنوری ۱۹۵۷ء ۔ آج شام میں کافی دیر چرچ میں رہا ۔ میں چرچ میں بالکل تنہا تھا ۔ میرا ذہن اور دل خدا کی اِس عظیم نعمت کو دوبارہ پا لینے کے بعد شکر ادا کرنے سے قاصر تھے ۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے میں سَر سے پاؤں تک شُکر کا لبادہ بھی اوڑھ لوں ، تب بھی خدا کا شُکر ادا نہیں کر سکوں گا ۔ چرچ میں عبادت سے فارغ ہو کر جُونہی میں مُڑا میں نے دیکھا کہ فادر آگسٹن کھڑے ہیں ۔ اُن کے شفیق چہرے پر نرم سی مُسکراہٹ پھیلی ہُوئی تھی ۔ میں ہلکا سا جُھک گیا ۔ اُنھوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھا اور پھر آگے بڑھ گئے ۔ گھر آنے کے بعد میں اپنے بُک شیلف سے کتابیں نکال کر ان کا مطالعہ کرنے لگا ۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں اپنے بچھڑے ہوئے دوستوں سے مل رہا ہُوں ۔ اتنے میں میری بیوی کافی لے کر اندر داخل ہوئی ۔

"ارے یہ کیا ! آپ پھر کتابیں پڑھنے لگے ؟" اُس نے حیرانی سے پوچھا ۔

"نہیں میں پڑھ تو نہیں رہا ۔ میں تو اپنے دوستوں سے مل رہا ہوں ۔ جن سے دس برسوں کے بعد آج ملاقات ہوئی ہے ۔" میں نے اپنی بیوی کو جواب دیا ۔

"جی نہیں ۔ اپنے ان دوستوں سے آپ بعد میں بھی مل سکتے ہیں ۔ پہلے کافی پیجیے ۔ اور پھر سو جائیے ۔" اُس نے کتاب میرے ہاتھ سے لے کر اُسے شیلف میں رکھ دیا ۔ میں نے ہنستے ہوئے کافی کا کپ اُٹھا لیا اور کافی پینے لگا ۔

(ریڈرز ڈائجسٹ ۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء)

آپ بیتی

اول انعام یافتہ

اَچّھی تقلید

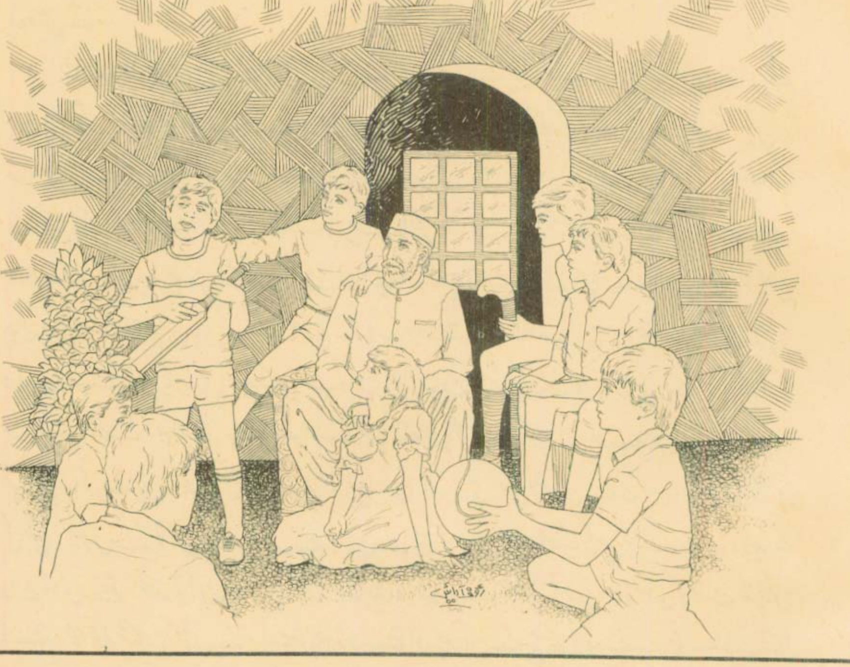

سید کاشان جعفری

"مار چھکّا" ...وقاص کی جونیئر شاہین کرکٹ ٹیم نے کورس کے انداز میں نعرہ لگایا... اور دس سالہ ننھے وقاص نے جاوید میانداد کے سے انداز میں زوردار طریقے سے بیٹ گھما دیا... کھٹ

"چھکّا"... ٹیم خوشی سے دیوانی ہوگئی۔ بال فضا میں تیرتی ہوئی شاداب لاج کی بلند و بالا دیوار کو پھلانگتی ہوئی وسیع و عریض لان کی جھاڑیوں میں روپوش ہوگئی۔

ہارتی ہوئی مقابل ٹیم نے سکون کا سانس لیا۔ اُس کے کپتان نے موقع کی نزاکت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے کہا۔"اب بال واپس لاؤ تو کھیل ہوگا... ورنہ ڈرا سمجھو۔"

فتح کو ہاتھ سے جاتا دیکھ کر وقاص اور اُس کی ٹیم کے ساتھی، کھلاڑی ہڑبڑا کر شاداب لاج کی بلند و بالا دیوار پر

چڑھنے کی ناکام کوشش کرنے لگے اور کچھ کوٹھی کے آہنی گیٹ سے اندر جھانکنے لگے۔

"چلو، اندر چل کر مانگ لاتے ہیں"... وقاص نے کہا۔

"اندر چل کر...؟ نہ بابا... نہ" سب ایک ساتھ جواب میں بولے۔ شاداب لاج کے اندر جانے کا سُن کر ہی وہ دہل گئے۔

شاداب لاج کی تاریخ بہت پُرانی تھی۔ بڑے، بوڑھے بتاتے ہیں کہ جب شاداب لاج تعمیر ہوا تو اس کے لان میں رنگ برنگے پھولوں کے پودے اور پھلوں کے درخت ہوا کرتے تھے۔ عربی گھوڑوں سے بھرا اصطبل... صاف سُتھرے چبوتروں اور مست اُچھلتے ہوئے فوارے۔ سجی ہوئی روشیں شاداب لاج واقعی سرسبز و شاداب تھا۔ آج کے جھاڑ، جھنکاڑ، اُجاڑ، شاداب لاج سے بالکل مختلف... بدلتے ہوئے وقت اور حالات نے شاداب لاج کو پوری طرح بدل کے رکھ دیا تھا۔ شاداب نگر کے چودھری صاحب کیا بدلے، ان کی وسیع وعریض جاگیرداری کا سارا انظام ہی بدل کر رہ گیا۔ کالونی کے لوگ جانتے تھے کہ شاداب لاج میں ضعیف العمر چوہدری صاحب اب بھی قیام پذیر ہیں۔ کبھی کبھی جب وہ اپنی لمبی سیاہ پرانی مگر چمک دار کار میں پچھلی سیٹ پر بیٹھے سر پر جناح کیپ لگائے۔ سیاہ چشمہ پہنے آتے، جاتے نظر آتے ہیں تو لوگ احترام میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وہ کیا ہیں کیا کرتے ہیں۔ اس کا بچّوں کو کوئی علم نہیں تھا۔ اور نہ ہی کبھی انہوں نے یہ سب جاننے کی کوشش کی تھی۔ بچّوں نے تو بس اپنے بڑوں سے یہ سُن رکھا تھا کہ چودھری صاحب کبھی بڑے رعب و دبدبے والے آدمی تھے۔ غصّہ تو اُن کی ناک پر رکھا رہتا تھا۔ معمولی سے معمولی قصور پر ملازموں کو سخت سزائیں دیتے۔ خونخوار شکاری کتّوں کے سامنے چھوڑ دیتے اور پھر اُن کے چیخنے چلّانے سے خوب لُطف اندوز ہوتے۔ کسی بھی ملازم کو نہایت خاموشی سے اس کی ملازمت سے برطرف کر دینا ان کے نزدیک بہت ہلکی سزا تھی۔ مگر پھر وہ ایک دم بدل گئے۔ اُن کی زندگی میں نہ جانے کیسے بڑا انوکھا مگر بہت ہی خوشگوار انقلاب آگیا۔ اُنھوں نے سارا کرّوفر ایک دم ختم کر دیا۔ بالکل سادہ زندگی گزارنے لگے۔ ملازموں کے ساتھ بھائیوں جیسا سلوک ہونے لگا۔ مگر اس انقلاب کی وجہ کسی کی سمجھ میں نہ آئی۔

جیسے جیسے وقت گزرتا گیا چودھری صاحب کی شخصیت لوگوں کے لیے ایک معمّہ بنتی چلی گئی۔ چودھری صاحب بڑے کنبے والے تھے، مگر اُن کا کنبہ کہاں تھا۔ وہ سب سے الگ تھلگ کیوں رہتے تھے۔ اس کا علم بھی کسی کو نہ تھا اور جو بات بڑوں کے علم میں نہ ہو بچّے بھلا اُس سے کیونکر واقف ہوتے۔ دنیا کے ہنگاموں اور مسائل سے گھِری زندگی میں اتنی فرصت کس کے پاس تھی کہ وہ چودھری

صاحب کی خاموش دُنیا میں جھانکتا۔ خود چودھری صاحب نے اپنے اردگرد خواہ مخواہ کی دیواریں کھڑی کرلی تھیں۔ اُنھوں نے کبھی یہ جاننے کی کوشش بھی نہیں کی کہ لوگ ان کے متعلق کیا سوچتے ہیں۔

شاداب لاج سے متّصل میدان میں بچّے روز کھیلتے تھے۔ وقاص کی جونیئر شاہین کرکٹ کلب کے کھلاڑی جو آج اپنی زندگی میں پہلی بار شاداب لاج کے اندر جانے کے لیے گیٹ پر آکھڑے ہوئے تھے میچ جیتنے کی معصوم سی خواہش نے ان کے دِل کے ہر خوف کو دُور کر دیا تھا۔ وقاص نے اپنا پورا زور لگا کر لوہے کے بھاری گیٹ کو اتنا کھول لینے میں کامیابی حاصل کرلی کہ وہ آڑے، ترچھے ہوکر اور ایک ایک کر کے اندر جاسکیں۔ اب وقاص سب سے آگے آگے ایک بہادر جرنیل کی طرح چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا کوٹھی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اُس کی ٹیم کے ننھے کھلاڑی پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ وقاص سیڑھیاں عبور کرتا اُوپر پہنچ گیا۔ اور پنجوں کے بَل کھڑے ہوکر اپنا ہاتھ گھنٹی کے بٹن تک پہنچانے اور اُسے دبانے میں کامیاب ہوگیا۔ اندر سے گھنٹی بجنے کی آواز اس طرح سُنائی دی گویا وہ کہیں دُور، کسی سرنگ میں بج رہی ہو... بچّے سہم کر واپس بھاگنے کو تیار ہوئے ہی تھے کہ یکایک دروازہ کھُلا اور ایک سُرخ وسفید رنگت کا لیم شیم شخص صاف سُتھری وردی میں ملبوس سامنے آیا اور بڑی نرمی سے پوچھا۔ "کیا بات ہے... بچّہ لوگو؟"

"ب... ب... بال... ہماری بال یہاں جھاڑیوں میں آگئی ہے... آپ اجازت دیں تو ہم خود اُسے تلاش کرلیں"۔ وقاص نے بمشکل تمام بڑی ہمت کرتے ہوئے اپنا مقصد بیان کیا۔

باوردی شخص نے جواب دینے کے لئے اپنے ہونٹ کھولے ہی تھے کہ اندر سے ایک بڑی نرم سی آواز آئی "... گل خان... کون ہے؟"

"کچھ بچّے ہیں کالونی کے... سرکار... اپنی گیند تلاش کرنے کے لیے اجازت مانگ رہے ہیں"... گل خان نے ادب سے جواب دیا۔

"انہیں میرے پاس بھیج دو..."۔ اندر سے پھر وہی نرم سی آواز آئی...

"اُف اللہ... اب کیا ہوگا"۔ ننھی آفرین نے خوف سے اپنے کانوں کو چھُوتے ہوئے کہا... جو دوسرے بچّوں کے ساتھ ساتھ اندر چلی آئی تھی۔ اس غیر متوقع صورتِ حال کے لیے تو کوئی بھی تیار نہ تھا۔ نہ ہی کسی نے سوچا تھا کہ اُنہیں اندر بھی طلب کیا جاسکتا ہے۔ سب بچّے حیرت اور خوف کے سے مِلے جُلے انداز میں ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ خود وقاص بھی اس انہونی کے لیے تیار نہ تھا۔ سب ایک دوسرے کے قریب سمٹ کر کھڑے ہوگئے۔ آفرین نے اپنا پسیجا ہُوا ہاتھ وقاص کے ہاتھ میں دے دیا۔

ایک بار پھر بڑے شیریں اور ٹھہرے ہوئے انداز میں وہی آواز اُن کے کانوں کے پردے سے ٹکرائی "گُل خان ... بچوں کو اندر لے آؤ نا"...

اب گُل خان نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر پُورا دروازہ کھول دیا اور بڑی شائستگی سے بولا۔" آؤ، بچو... آؤ... چودھری صاحب آپ سب کو اندر بلا رہے ہیں"۔ اب اندر جائے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔ سات ننھے منے دھڑکتے دلوں نے ہمت کا دامن مضبوطی سے تھاما... اللہ کا نام لیا اور دِل ہی دِل میں جَل جلال تو، آئی بلا کو ٹال تو۔ کا وِرد کرتے ہوئے گُل خان کے پیچھے پیچھے کمرے میں داخل ہو گئے۔ ریشمی پردوں قیمتی گُل دانوں اور پیر دھنستے نرم موٹے ایرانی قالینوں سے سجے کمرے میں چھوٹے چھوٹے جھجھکتے ہوئے سے قدم اُٹھاتے چودھری صاحب کے سامنے پہنچ گئے۔ جو کمرے کی وسطی کھڑکی کے قریب ایک بڑی سی آبنوسی آرام کرُسی پر نیم دراز تھے۔ اُن کے شانوں پر عُمدہ سفید کشمیری شال پڑی ہوئی تھی۔ سفید گلاب کی سی رنگت والے چہرے پر بڑی دل آویز سی مُسکراہٹ اور آنکھوں میں شفقت و محبّت کا اُمڈتا ہُوا رنگ جھلک رہا تھا۔ چودھری صاحب کے سراپے اور لبوں پر سجی مسکراہٹ نے بچّوں کے دلوں میں بیٹھا ہُوا انجانا خوف دُور کر دیا۔ وہ اب سوچ رہے تھے کہ اتنے اچھّے آدمی کے متعلق لوگوں نے کیسی کیسی خوفناک باتیں مشہور کر رکھی ہیں۔

"یہ چودھری صاحب تو بالکل داداجان اور نانا ابّو کی طرح کے ہیں"۔ ننھی آفرین نے سرگوشی کے سے انداز میں وقاص سے کہا، اور جواب میں اُس نے دھیرے سے آفرین کا ہاتھ دبا کر چُپ رہنے کا اشارہ کیا۔ اب وقاص کا اعتماد بھی بحال ہو چکا تھا۔ اُس نے بغیر کسی تمہید کے چودھری صاحب کو پورا واقعہ سُنایا۔ کہ وہ کس طرح کرکٹ کھیل رہا تھا۔ ساتھیوں نے چھکّا مارنے کی فرمائش کی اور اُس نے چھکّا مار دیا۔ گیند کوٹھی کے احاطے کی دیوار سے ہوتی ہوئی لان کے اندر جھاڑیوں میں آگری۔ پھر کھیل رُک گیا۔ میچ جیتنے کے لیے گیند کی ضرورت ہے۔ اس کی بات ختم ہوتے ہی کاشف بھی بولنے کی ہمت کر بیٹھا اور کہنے لگا۔" انکل... ہم خود تلاش کر لیں گے اپنی گیند کو... اور... اور بڑی احتیاط سے کھیلیں گے۔ آپ کے لان کو بالکل خراب نہیں کریں گے"۔

"انکل... پلیز... ہمیں اجازت دے دیجیے۔ گیند تلاش کرنے کی"۔ آفرین اس موقعے پر بھلا کیوں چُپ رہتی۔ اُسے تو چودھری صاحب پہلی ہی نظر میں اچھے لگے تھے۔ بالکل اپنے نانا ابّو جیسے۔ وہ بھی سارا ڈر خوف ایک طرف رکھتے ہوئے بولی۔" نانا ابّو... نانا ابّو... میں ان لوگوں سے کہوں گی کہ آپ کی کوٹھی سے دُور ہٹ کر کھیلیں تاکہ ان کی گیند دوبارہ یہاں نہ آنے پائے اور میں سب کی طرف سے یہ بھی وعدہ کرتی ہوں کہ ہم لان میں سے پھول بھی نہیں توڑیں گے"۔

بچوں کی معصوم باتیں چودھری صاحب کو پہلے ہی لُبھا رہی تھیں ... آفرین کے نانا ابّو کہہ کر مخاطب کرنے پر تو وہ کھل ہی اُٹھے۔ ان کی مُسکراہٹ اور گہری ہوگئی ۔ آنکھوں کے چراغ اور روشن ہو گئے ۔ وہ اپنی شاندار آرام کُرسی پر سیدھے ہو کر بیٹھ گئے ۔اور سب بچوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگے: "میرے پیارے بچّو! مجھے معلوم ہے کہ تم لوگ کسی چیز کو نقصان نہیں پہنچاؤ گے ... نہ کوئی پھُول توڑے گا ... نہ تتلی پکڑنے کی کوشش کرے گا ... لیکن ... کیا تم لوگوں کو بہت جلدی ہے ... میرا دل چاہ رہا ہے کہ تم لوگ اسی طرح دیر تک مجھ سے باتیں کرتے رہو۔ میں سُنتا رہوں .... بہت اچھا لگ رہا ہے مجھے تمہاری معصوم اور بھولی بھالی باتیں سُن کر ... اور ہاں بھئی ... دیکھو ... تم سب کھیلتے کھیلتے تھک بھی تو گئے ہو گے ۔ اسی بہانے کچھ دیر آرام اور ستانے کا موقع بھی مل جائے گا تمہیں ۔ اب رہی بات گیند کی تو اُسے تم بھُول جاؤ ۔ اب میں تمہیں اپنی طرف سے نئی گیند دوں گا۔" پھر گُل خان کو مخاطب کر کے کہنے لگے: "دیکھو میاں گُل خان ۔ بچّوں کے لیے کچھ کھانے پینے کو لاؤ۔ یہ ہمارے ننھے منّے مہمان پہلی بار یہاں آئے ہیں ۔ ان کی کچھ تو خاطر تواضع ہونی چاہیے۔" بس ... ساری بات یہیں سے شروع ہوئی ۔

وقاص نے اپنی ٹیم کا تعارف کرایا ... سب سے پہلے اپنا: "میں وقاص ہوں ، ٹیم کا کپتان ... سرکاری اسکول میں پانچویں جماعت کا طالب علم بھی ہوں ۔ تیسری اور چوتھی کلاس میں اوّل پوزیشن بھی لی تھی ... یہ کاشف ہے ہمارے کلب کا فاسٹ بالر ... یہ پڑھنے کے علاوہ اپنے ابّا کے ساتھ خالی وقت میں دکان پر بھی بیٹھتا ہے اور کبھی کبھی بلاوجہ اسکول کا ناغہ بھی کر لیتا ہے ۔ راستے سے گھر لوٹ کر اپنی امّی سے کہتا ہے کہ آج اسکول بند ہے ۔ اور یہ اپنی امّی کا کہنا بالکل نہیں مانتا ۔

یہ ذیشان ہے ... بڑا اچھا بلّے باز ... یوں کہیے ذیشان ہماری ٹیم کا جاوید میاں داد ہے ... اسے آؤٹ کرنا بہت مشکل کام ہوتا ہے ۔جتنا اچھا کھیلتا ہے ... اُتنا ہی اچھا پڑھتا لکھتا بھی ہے ۔اس کی تو کہانیاں بھی چھپتی ہیں ۔ اخباروں میں ... اور ... یہ ، یہ آفرین ہے ۔اس نے قرآن شریف ختم کر لیا ہے ۔ اسے پڑھنے کا شوق ہے ۔ مگر اس کی امّی اسے اسکول نہیں بھیجتیں کہتی ہیں سرکاری اسکول ہے تو کیا ہُوا ۔ کتابوں ، کاپیوں کے لیے خرچہ کہاں سے لاؤں ۔ آفرین گھر میں اپنی امّی کا خوب ہاتھ بٹاتی ہے ۔ اس کے ابّو نہیں ہیں ۔وہ ٹریفک کے ایک حادثے میں ہلاک ہو گئے تھے ... اور یہ انور ہے ... اس کی امّی نہیں ہیں ... یہ ہمارے گھر میں پڑھتا ہے ... اس کے ابّو خود اپنے آپ کھانا پکاتے ہیں ۔ اور اس کے لیے رکھ کر ڈیوٹی پر چلے جاتے ہیں ۔ انور کو بھی پڑھنے کا بہت شوق ہے۔" اسی طرح بقیہ دوسرے ساتھیوں کا بھی وقاص نے تعارف کرا دیا ۔

تعارف ختم ہوا تو گل خان ٹرالی میں بہت ساری کھانے پینے کی چیزیں رکھے ہوئے وہاں واپس آگیا۔ اور اُنہیں بڑی سی ڈائننگ ٹیبل پر قرینے سے سجانے لگا... کیک... پیسٹری... بسکٹ، چائے اور ڈھیر سارے تازہ، تازہ پھل... کاشف کے منہ میں تو پانی بھر آیا... اور آفرین... اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگی۔

کاشف کو کیک، پیسٹری بہت پسند تھے۔ مگر اُسے گھر سے اتنے پیسے نہیں ملتے کہ اپنا شوق پُورا کر سکتا۔ ان کے ابو بہت غریب تھے۔ دس بارہ گھنٹے کام کرتے تب کہیں اتنا ملتا کہ گھر کا خرچہ چلا سکیں۔ اسی لیے تو وہ فالتو ٹائم میں کاشف کو بھی دکان پر بُلا لیتے۔ تمام چیزیں میز پر لگ چکیں تو چودھری صاحب نے بچّوں کو کھانا شروع کرنے کے لئے کہا۔ کھانے کے دوران اچھی اچھی باتیں بھی ہوتی رہیں۔ بچّوں نے بڑے سلیقے اور ادب سے کھایا۔ نہ کوئی چیز کپڑوں پر گرائی۔ نہ اپنے ہاتھ گندے کئے۔ یُوں انہوں نے چودھری صاحب کو ذرّہ برابر بھی یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ وہ سب کسی اچھی جگہ پر پہلی دفعہ آئے ہیں۔ جب وہ جانے کے لیے اُٹھے تو چودھری صاحب نے کھڑے ہو کر سب بچّوں کو پیار کیا۔ ان کے سروں پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور شکریہ ادا کیا۔ یہی نہیں بلکہ وہ بچّوں کے ساتھ ساتھ دروازے تک اُنہیں چھوڑنے اور خدا حافظ کہنے بھی آئے۔ دروازے پر پہنچ کر چودھری صاحب نے نئی خوبصورت چہچہاتی گیند وقاص کی طرف بڑھاتے ہوئے بچّوں سے کہا آئندہ بھی وہ، کبھی کبھی وقت ملے تو ان کے یہاں بلا تکلّف اور بلا خوف و خطر آجایا کریں۔ اور بچّوں نے آئندہ آتے رہنے کا وعدہ بھی کر لیا۔

بچّے اپنی بات کے سچے تھے۔ اُنہوں نے چودھری صاحب سے ملتے رہنے کا وعدہ بھی نبھایا۔ جب کبھی اُنھیں اپنے کھیل، پڑھائی اور گھریلو ذمّے داریوں سے وقت ملتا سب کے سب گروپ بنا کر کوٹھی میں پہنچ جاتے۔ مگر ہر بار کوئی نہ کوئی ایک یا دو کم ضرور ہوتے۔ پھر بھی یہ عجیب اتفاق تھا کہ آفرین کبھی کم نہیں ہوئی۔ وہ ہر بار آنے والے گروپ میں پابندی سے شامل ہوتی... چودھری صاحب اپنی دلفریب مُسکراہٹ کے ساتھ بڑی اپنائیت، محبّت اور خلوص سے ملتے۔ ہر بار یہی تاثر ملتا گویا وہ اُن بچّوں کا انتظار کر رہے ہوں۔ وہ بچّوں کے ساتھ گھُل مِل جاتے۔ اُن کے پاس کہانیوں اور خوبصورت باتوں کا کبھی نہ ختم ہونے والا خزانہ تھا۔ اُن کی کہانیوں کا محور پیارے نبیؐ کی ذات تھی۔ یا پھر اُن کے صحابہ کرامؓ کی ایمان افروز باتیں۔ کبھی کبھی وہ ایسی دلچسپ کہانیاں بھی سُناتے جن کے کردار بچّوں کے گرد گھُومتے۔ چودھری صاحب کی کہانیوں میں بادشاہ ملکہ، جنّ اور پریوں کا کوئی ذکر نہیں ہوتا۔ مگر پھر بھی بچے اُنہیں بڑی دلچسپی اور توجّہ سے سُنتے۔ اس کی وجہ چودھری صاحب کے کہانی سُنانے کا اپنا منفرد اور دلچسپ انداز تھا۔ شروع شروع میں تو وہ اپنے ہی بچپن

کے متعلق بتاتے رہے۔ پھر اپنے بچوں کی باتیں۔ قصے، واقعات، کہانیاں، سب ہی کچھ سُنانے لگے۔ ان کی ہر کہانی کسی نہ کسی کے بچپن کے گرد ضرور گھومتی جس سے ظاہر ہوتا کہ وہ بچوں کو کس قدر پسند کرتے ہیں چودھری صاحب کو ہر ایک کے بچپن کی کہانیاں یاد تھیں۔ پیارے نبیؐ کا بچپن، حضرت علیؓ کے بچپن کے واقعات حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کے بچپن کی باتیں۔ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے بچپن کا قصہ۔ بعض واقعات تو اس قدر دلچسپ ہوتے کہ بچے دوبارہ، سہ بارہ سُننے کی فرمائش کرتے ... "انکل! وہ والی ضرور سُنائیے۔

جب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ فتح کیا تھا... یا پھر وہ والی جب اہل طائف نے آپؐ کو پتھروں سے لہولہان کر دیا اور فرشتے اللہ کے حکم سے آپؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس آکر پوچھنے لگے کہ اے اللہ کے رسولؐ اگر آپ کہیں تو ہم اس شہر کی پہاڑیاں آپس میں ملا دیں۔ اور آپؐ نے فرمایا تھا "نہیں، میں رحمۃ اللعالمین بنا کر بھیجا گیا ہوں"۔ کوئی فرمائش کرتا... "چودھری انکل... چودھری انکل! آج حضرت عمر فاروقؓ کے ایمان لانے کا واقعہ سُنائیے۔ جب وہ نعوذ باللہ... پیارے رسول حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کے ارادے سے نکلے اور بارگاہِ نبویؐ میں پہنچے تو کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گئے"۔ کاشف اپنی پسند بتاتا۔

ایک دن ہم سب اُن کے کمرے میں کہانیاں سُن رہے تھے۔ چودھری صاحب بھی بڑے موڈ میں تھے کہ میں نے اُن سے سوال کیا "انکل، آپ کو اتنی اچھی اچھی کہانیاں کیسے یاد ہو گئیں۔ جب کہ آپ خود اپنے بچپن میں پڑھنے لکھنے کے مقابلے میں کھیلوں سے زیادہ رغبت رکھتے تھے"۔

میرا یہ سوال سُن کر وہ ایک دَم سنجیدہ ہو گئے۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے کہنے لگے "وقاص... یہ کیا بات پُوچھ لی۔ مگر خیر سُنو، شاید تم لوگوں کو میری کہانی سے کوئی کام کی بات معلوم ہو سکے۔ یہ بہت پُرانی بات ہے اُس وقت میں جوان تھا اور میں نے بڑے چودھری صاحب (میرے والد) کے سامنے ہی جائیداد کی دیکھ بھال کا کام سنبھال لیا تھا۔ اُس وقت میں ایک بہت بڑا زمیندار تھا۔ کسی کو بھی میرے سامنے سر اُٹھا کر بات کرنے کی ہمت نہ تھی۔ گاؤں کے سارے ہی لوگ مجھ سے ڈرتے اور میرا سامنا کرتے ہوئے گھبراتے تھے۔ میرے مزاج میں سختی جو بہت تھی۔ ذرا ذرا سی بات پر سخت سزائیں سُنا دیا کرتا تھا غریبوں کو۔ مجھے پڑھنے لکھنے سے کوئی رغبت نہیں تھی۔ ایک دن میں اپنے کھیتوں کا معائنہ کرنے نکلا تو ایک کسان نے جو اپنے کام میں مصروف تھا مجھے آتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اور سلام نہیں کیا۔ مجھے غصّہ آگیا اور اُسی وقت اپنے دوسرے کارندوں سے اچھی خاصی مرمّت کرا دی اُس کی... اس پر بھی میرا غصّہ کم نہ ہوا تو اُسے بال بچوں سمیت اپنے گاؤں سے زبردستی نکلوا دیا۔ اس واقعے کے چند روز بعد کی بات ہے، میرے ایک چچا زاد بھائی نے جو حج کر کے آئے

تھے۔ مجھے ایک قرآن شریف اُردو ترجمے والا تحفے میں دیا۔ میں اُسے دیکھنے لگا۔ اچانک میری نظر ۲۱ ویں پارے کی ۱۹ ویں آیت کے اسی ترجمے پر جم گئی

"تم لوگوں کے لیے یعنی ایسے شخص کے لئے جو اللہ اور روزِ آخرت سے ڈرتا ہو اور کثرت سے ذکرِ الٰہی کرتا ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک عمدہ نمونہ موجود تھا"... بس بچو... کیا بتاؤں اُس ترجمے کو پڑھتے ہی میرے دل کی حالت عجیب سی ہوگئی۔ میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوگئے... مجھے ایک ایک کرکے وہ مظالم اور سختیاں یاد آنے لگیں جو میں نے بطورِ زمیندار اپنے مزارعوں، کسانوں اور غریب مزدوروں پر کئے تھے۔ اُسی دن سے میں نے یہ معمول بنالیا کہ تھوڑا تھوڑا قرآن کریم ترجمے کے ساتھ پڑھنے اور سمجھنے لگا جُوں جُوں میں قرآنِ کریم پڑھتا اور سمجھتا میرے دل و دماغ روشن ہوتے جاتے۔ تیسرے پارے کی ۱۲ ویں آیت میں پڑھا

" آپؐ فرمادیجیے کہ اگر تم خدائے تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو میرا اتباع کرو۔ خدا تعالیٰ تم سے محبت کرنے لگیں گے۔ اور تمہارے سب گناہ معاف کردیں گے۔ اللہ تعالیٰ بڑے معاف کرنے والے، بڑی عنایت فرمانے والے ہیں"۔ اس آیت کے پڑھنے کے بعد ہی سے میں نے اپنے آپ کو بالکل بدل لیا۔ میری ساری کوشش یہ ہونے لگی کہ میں اپنے پیارے رسولؐ کی زندگی کا اتباع کرنے لگوں۔ تاکہ مجھے اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل ہوجائے میرے پچھلے گناہ اور اللہ کے بندوں کے ساتھ کی ہوئی ساری زیادتیوں سے معافی مل جائے۔ میں نے اُن تمام لوگوں سے مل کر فرداً فرداً معافی مانگی جن کو میری وجہ سے تکلیفیں پہنچی تھیں۔ اپنی بہنوں کو اُن کا حصہ ادا کیا، جو میں نے پہلے سب سے بڑا بھائی ہونے کے ناتے دبا رکھا تھا۔ بھائیوں کے ساتھ کی جانے والی حق تلفی کا بھی ازالہ کیا... اور پھر یہ وطیرہ بنالیا کہ اپنی زندگی کا ہر فعل رسولِ اکرم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور سنت کے مطابق گزاروں۔ یہ زمین جس پر شاداب کالونی آباد ہے۔ میری ہے۔ مگر میں نے اسے اللہ کے ضرورت مند بندوں کے لیے مُفت چھوڑ دیا۔ میری اس تبدیلی کو بہت سے لوگوں نے جن میں اہلِ خاندان بھی شامل تھے پاگل پن قرار دیا۔ قرابت داروں نے کنارہ کشی اختیار کرلی اور یوں میں بھی رفتہ رفتہ بالکل تنہا ہوتا چلا گیا۔ مگر میں نے اس کی پرواہ نہیں کی۔ بلکہ اسے اللہ کی طرف سے آزمائش اور امتحان سمجھا۔ اپنے کام خود آپ کرنے شروع کردیئے۔ بچو! یہ ٹھیک ہے کہ مجھے پڑھنے لکھنے کی عمر میں حصولِ علم کا کوئی شوق نہیں تھا۔ مگر یہ جاننے کے بعد کہ علم حاصل کرنے کا حکم خود رسولؐ خدا نے بھی دیا ہے۔ میں نے اچھی کتابوں کو پڑھنا شروع کردیا۔ یوں میرے علم میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔ قرآنِ کریم ہی میں اللہ تعالیٰ

دوسرے پارے میں ارشاد فرماتے ہیں کہ جس طرح تم لوگوں میں ہم نے ایک عظیم الشان رسول کو بھیجا تم ہی میں سے ہماری آیات (و احکام پڑھ پڑھ کر) تم کو سناتے ہیں، تمہاری صفائی کرتے رہتے ہیں۔ اور تم کو کتابِ الٰہی اور فہم کی باتیں بتلاتے رہتے ہیں۔ اور تم کو ایسی مفید باتیں تعلیم کرتے ہیں جن کی تمہیں خبر نہ تھی... بچّو... کیا بتاؤں... ان آیات کو پڑھنے اور سمجھنے کے بعد میری کیا حالت ہوئی... میرے ذوقِ علم میں اور اضافہ ہو گیا۔"

اتنا کہہ کر چودھری صاحب سانس لینے کے لیے رُکے تو کاشف نے موقع غنیمت جان کر اپنا سوال سامنے رکھتے ہوئے کہا۔" انکل! کیا اپنا کام آپ کرنا اور علم حاصل کرنا بھی اسلامی تعلیمات میں شامل ہے؟"

"ہاں بیٹے... بڑا اچھا سوال کیا آپ نے"۔ چودھری صاحب مسکرا کر اُس کی طرف دیکھتے ہوئے بولے پھر کہنے لگے۔" ہمارے پیارے رسول حضرت محمّد صلی اللہ علیہ وسلم بھی خود اپنا کام آپ کرتے تھے۔ بلکہ پیارے نبیؐ جب بازار تشریف لے جاتے تو پاس پڑوس والوں سے بھی پوچھ لیا کرتے، کسی کو کچھ منگانا تو نہیں ہے۔ اُن کی اسی تربیت کا اثر تھا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ خلیفہ منتخب ہونے کے بعد بھی ایک غریب یتیم لڑکی کی بکریاں دوہنے کے لیے اس کے گھر جاتے رہے۔ اسی بات نے مجھے بھی اپنے کام خود کرنے پر اُکسایا۔"

" پھر تو انکل میں بھی اپنے کام اور اپنے گھر کا کام خود کیا کروں گا۔" کاشف نے کہا۔ اُس کے چہرے پر عجیب سی چمک اور لبوں پر نرم سی مسکراہٹ تھی۔

" کاشف بیٹے... اپنا کام آپ کر لینا تو اچھی بات ہے ہی۔ اس سے بھی اچھی بات یہ ہے کہ دوسروں کا کام بھی اُن سے پوچھ کر کر دیا جائے۔" انکل نے بڑی شفقت سے کہا۔

" انکل، انکل... میں وقاص کے یہاں پڑھنے جاتی ہوں تو اُن کے گھر کا بہت سا کام بڑے شوق سے کرتی ہوں... حالانکہ آنٹی منع بھی کرتی ہیں کہ تم پڑھنے آئی ہو، بیٹھ کر پڑھو"... آفرین نے اپنی بڑی، بڑی پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا اور سب اُس کی طرف دیکھنے لگے۔

چودھری صاحب نے اُس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا:" ارے آپ تو بہت ہی پیاری بیٹی ہیں"۔

اس پر راغب نے سوال کیا۔" انکل آپ کے بچّے یعنی بیٹے، بیٹی کہاں ہیں؟" اور یہ سوال سُنتے ہی چودھری صاحب کے لبوں کی مُسکراہٹ پھیکی پڑ گئی۔ آنکھوں کی چمک ماند اور چہرے کی شفق دُھندلا گئی... پھر جیسے اُنھیں کچھ یاد آگیا۔ پیار بھرے انداز میں کہنے لگے..." میرے بچّے... تم ہی لوگ تو میرے بچّے ہو... یہ آفرین میری بیٹی ہے اور تم سب بیٹے..." کہتے کہتے اُن کے لبوں کی مسکراہٹ پھر گہری ہو گئی۔

آنکھوں کی چمک اور چہرے کی شفق پھر لوٹ آئی ۔۔ اور اُس دن کے بعد سے چودھری صاحب نے شاداب کالونی کے بہت سے خستہ حال گھرانوں کی کفالت اپنے ذمّے لے لی۔ اب ان کی زندگی پر راز کا کوئی پردہ باقی نہیں رہا تھا۔ سب اُنہیں جاننے لگے تھے کہ وہ ایک نیک دل انسان ہیں۔ ایسا انسان جو اپنے پیارے رسولؐ کی زندگی اور باتوں کو اپنی زندگی میں ڈھالنے کی کوشش کر رہا ہے۔ شاداب کالونی کے لوگ بھی اسی نیک شخص کی تقلید کرنے میں ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی کوشش کرنے لگے تھے......

اور بچوں کی تو دنیا ہی بدل گئی تھی۔

گر نہیں رہا

چھٹی جماعت کا ڈرائینگ کا پیریڈ شروع ہُوا۔ ڈرائینگ ٹیچر کلاس میں آئے اور بچّوں سے کہا۔

"آج کے پیریڈ میں آپ لوگ ایک درخت بنائیں گے۔ لیکن کھڑا ہُوا نہیں بلکہ گرا ہُوا درخت۔" بچّوں نے اپنی اپنی کاپیاں اور برش وغیرہ نکالے اور درخت کی تصویر بنانا شروع کردی۔ جو بچّہ تصویر مکمّل کرلیتا ٹیچر کو دکھاتا، ٹیچر صاحب ڈرائینگ دیکھتے اور اس کو مزید بہتر بنانے کی ہدایت دیتے رہے۔ پیریڈ ختم ہونے میں کچھ ہی دیر رہ گئی تھی تقریباً تمام ہی بچّے اپنی اپنی ڈرائینگ ٹیچر کو دکھا چکے تھے۔ بس ایک نعیم ہی باقی رہ گیا تھا۔ ٹیچر نے نعیم سے پوچھا۔

"ہاں بھئی نعیم! تم نے بنالی ڈرائینگ؟"

"جی ہاں سر! بنا تو لی ہے۔" تعیم نے کہا۔

"تو پھر لے آؤ! دکھاتے کیوں نہیں؟"

"سر! درخت بنا تو لیا ہے مگر..."

"مگر کیا...؟"

"سر!... بنا تو لیا ہے مگر... وہ گر نہیں رہا مجھ سے۔"

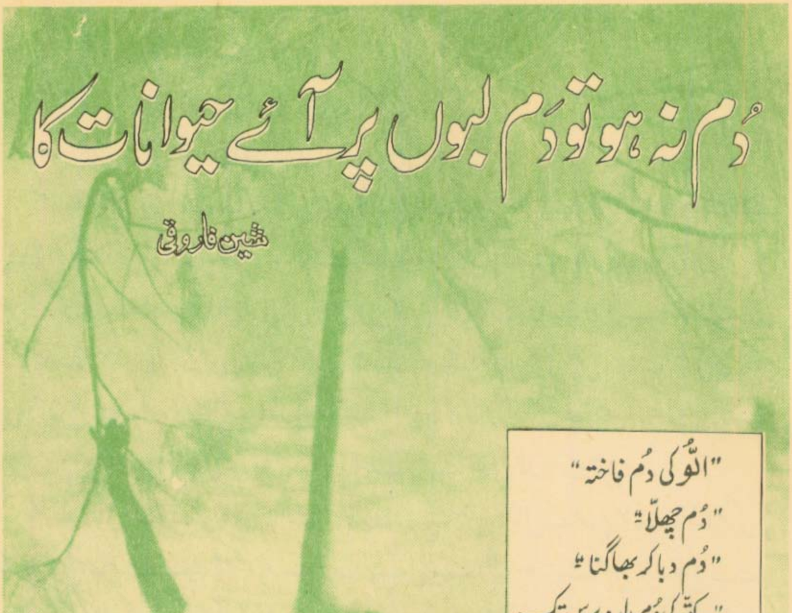

دُم نہ ہو تو دَم لبوں پر آئے حیوانات کا

شین فاروقی

"الّو کی دُم فاختہ"
"دُم چھلّا"
"دُم دبا کر بھاگنا"
"کتے کی دُم بارہ برس تک نلکی میں رہ کر بھی ٹیڑھی کی ٹیڑھی رہی" آپ نے ایسے بہت سے محاورے، کہاوتیں اور ضرب الامثال پڑھی ہوں گی۔ جن میں دُم کا لفظ کسی نہ کسی طور پر استعمال ہُوا ہے۔ اور عجیب حیرت کی بات یہ ہے کہ ان محاوروں وغیرہ میں دُم کا لفظ ہمیشہ بُرے معنوں ہی میں استعمال کیا گیا

شاید یہی وجہ ہے کہ ہم دُم کو بڑی حقیر سی چیز سمجھتے ہیں۔ حالانکہ صورتِ حال اس کے برعکس ہے۔ حیوانات کی زندگیوں پر کام کرنے والے سائینسدانوں نے مختلف جانوروں کی دُموں پر طویل تحقیق کے بعد جو نتائج حاصل کیئے ہیں اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہر حیوان کی دُم اُس حیوان کے لیے اتنے بہت سارے کام انجام دیتی ہے کہ ہم انسان اُن کا تصوّر بھی نہیں کر سکتے۔ سائنس دانوں کے مطابق جانور اپنی دُم سے تین طرح کے کام لیتے ہیں۔

۱۔ میکانی یعنی Mechanical
۲۔ جسمانی یعنی Physiological
۳۔ ابلاغی یعنی Communicative

دُم کے میکانی وظائف سے کم و بیش سب لوگ واقف ہیں۔ مثال کے طور پر کنگارو بھاگتے ہوئے یا اُچھلتے ہوئے دُم کو اپنا جسمانی توازن برقرار رکھنے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ عام مچھلیاں اور خاص طور پر وہیل دُم کو پتوار کے طور پر استعمال کرتی ہیں۔ اسی طرح گلہریاں ایک درخت سے دوسرے درخت پر چھلانگ لگاتے ہوئے دُم کو اپنی مختصر سی پرواز کو متوازن بنانے کے لیے استعمال کرتی ہیں۔ جنوب مشرقی ایشاء اور جنوبی افریقہ میں پینگولین نام کا ایک جانور پایا جاتا ہے۔ اس جانور کو مور خور بھی کہتے ہیں۔ درختوں پر رہنے والا پینگولین اپنی دُم کو درخت کی کسی شاخ کے گرد لپیٹ کر اپنے شکار پر حملہ آور ہوتا ہے۔

دُم کے جسمانی وظائف میکانی وظائف سے بھی زیادہ دلچسپ ہیں۔ مثال کے طور پر مختلف اقسام کی چھپکلیاں اپنی حفاظت کے لیے دُم کو جسم سے علیحدہ کرنے کی حیرت انگیز صلاحیت رکھتی ہیں۔ ممکن ہے آپ چھپکلیوں کی ایسی کسی قسم کی چھپکلی کو دُم سے پکڑ لیں اور وہ اچانک دُم کو آپ کے ہاتھ میں چھوڑ کر رفوچکر ہو جائے۔

بعض دودھ پلانے والے جانوروں کی دُم بھی حیرت میں ڈال دینے والی صلاحیتوں کی حامل ہوتی ہے۔ مثلاً جنگلوں میں رہنے والے چوہے اپنی دُم کی کھال کو چند لمحوں میں اُتار دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ سائنس دانوں کے بقول جنگل میں پائے جانے والے چوہوں میں سے پچاس فیصد وہ ہوتے ہیں، جنھوں نے کبھی نہ کبھی اپنی دُم کی کھال اُتار کر اپنے دشمن سے اپنی دُم اور دُم کے ساتھ اپنی جان بچائی ہوتی ہے جنگلوں میں گلہری اور چوہے سے ملتا جلتا ایک جانور Dormouse بھی بڑی دلچسپ دُم رکھتا ہے۔ اس جانور کی دُم میں تقریباً آٹھ سینٹی میٹر کے بعد ایک جوڑ واقع ہوتا ہے۔ چنانچہ ہوتا یہ ہے کہ اُس کا دُشمن جب اُس کی دُم پکڑتا ہے تو اُس کی دُم کا ایک جوڑ اُس کی دُم سے علیحدہ ہو کر اُس کے دُشمن کے منہ میں رہ جاتا ہے اور Dormouse جان بچا کر بھاگ جاتا ہے۔ اس جانور کی دُم میں چونکہ بہت سے جوڑ ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ اکثر اپنے دشمن سے اپنی دُم چھڑا کر بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔

موٹی دُم والی گلہریاں سرد موسم میں دُم کو اپنے گرد لپیٹ کر اُس سے گرمی حاصل کرتی ہیں اور پھر سو جاتی ہیں۔ گلہریوں کی طرح اور بھی بہت سے جانور دُم کو گرمی کے حصول کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

چیونٹیاں کھانے والا ایک جانور اپنی بالوں سے بھری دُم کو نرم بستر کے طور پر بھی استعمال کرتا ہے۔ بہت سے جانور نہ صرف یہ کہ دُم سے گرماہٹ حاصل کرتے ہیں بلکہ وہ اسے اپنے جسم کے گرد لپیٹ کر خود کو دشمن سے بھی محفوظ کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر پینگولین کے جسم پر دُم سے لے کر پُشت کے آخری سرے تک سخت نوکیلے کانٹے موجود ہوتے ہیں۔ چنانچہ پینگولین جب کبھی جان کا خطرہ محسوس کرتا ہے تو اپنی دُم کو اپنے جسم کے گرد لپیٹ لیتا ہے اور اس طرح خود کو محفوظ کر لیتا ہے۔ ماہرین کے بقول دو طاقت ور آدمی بھی اُس کی دُم کی گرفت کو ڈھیلا نہیں کر سکتے۔

دنیا میں پائے جانے والے بہت سے جانور اپنی دُم کو غذائی اجزا جمع کرنے کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں۔ مڈغاسکر میں پائے جانے والا خرگوش کے حجم کا ایک جانور اس صلاحیت کا حامل ہوتا ہے۔ یہ جانور برسات کے دنوں میں (جو اُس کے لیے سب سے اچھا موسم ہوتا ہے) اپنی دُم میں چربی کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ جمع کر لیتا ہے۔ خشک موسم میں یہ جانور کسی درخت پر بنے گھونسلے میں آرام سے کنڈلی مار کر سو جاتا ہے۔ اس دور میں یہ جانور اپنی دُم میں جمع ہو جانے والے غذائی اجزا کو بھوک مٹانے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس موسم میں اُس کی دُم ہر روز پتلی سے پتلی ہوتی چلی جاتی ہے۔

دُم کا سب سے دلچسپ کام ابلاغی یعنی پیغام دینے کا ہے۔ جب کسی شخص کا کُتا اُس کے گھر آنے پر ہولے ہولے بھونکتا ہُوا اور دُم ٹاٹا، بائی بائی کرتا ہُوا یعنی دائیں بائیں ہلاتا ہُوا آتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کتا اپنے مالک کے گھر آنے پر خوشی کا اظہار کر رہا ہے۔ دُم کو دائیں بائیں ہلا کر صرف کتے ہی نہیں بلکہ بھیڑیے بھی مخصوص کیفیات کا اظہار کرتے ہیں۔ ماہرین کے مطابق بھیڑیے جب غول کی صورت میں سفر کرتے ہیں تو وہ ایک دوسرے کی دُموں کی پوزیشن سے مختلف معنی اخذ کرتے ہیں۔

ابھی حال ہی میں سائنس دانوں نے امریکہ میں پائے جانے والے جانور پاکٹ مائس کی دُم کی حرکت کے معنی معلوم کیے ہیں۔ اس جانور کا سب سے بڑا دشمن سانپ ہے۔ کہتے ہیں کہ جب کسی پاکٹ مائس کے سامنے کوئی سانپ نمودار ہوتا ہے تو وہ مشکل حال میں ہونے کے باوجود راہِ فرار اختیار نہیں کرتا۔ بلکہ اس کے برعکس وہ عام طور پر اپنے دوستوں وغیرہ کو جمع کر کے ایک گروہ کی شکل بنا کر سانپ کی جانب پیش قدمی کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک جانور کے مقابلے میں جانوروں کے ایک گروہ کو کم خطرہ لاحق ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ جانور ایک گروہ کی شکل میں سانپ پر حملہ آور ہوتا ہے اور اکثر اُسے بھاگنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ حملے کے لیے پاکٹ مائس اپنی دُم کی مختلف حرکتوں کے ذریعے اپنے ہم جنسوں کو سانپ کے اطراف مختلف

دم کا کوئی اہم مسئلہ
یقیناً زیر غور ہے

پوزیشنیں سنبھالنے کا اشارہ کرتا ہے۔ اگر پاکٹ ماٹس کو سانپ پر عمومی حملہ کرنا ہو تو وہ اپنی دُم کو تین بار دائیں بائیں ہلاتا ہے۔ اگر اُسے سانپ پر مسلسل حملہ جاری رکھنا ہو تاوقتیکہ وہ ہلاک ہو جائے تو پھر یہ جانور دُم کو دو بار دائیں بائیں حرکت میں لاتا ہے اور اگر اُسے اپنا حملہ روکنا ہو تو وہ دُم کو صرف ایک بار دائیں بائیں گردش دیتا ہے۔

یہ جانور مختلف درجوں کے خطرات کی نشاندہی کے لیے دُم کی مختلف حرکتوں کو استعمال میں لاتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ جانور سب سے زہریلے سانپ کو دیکھتا ہے جو کہ ظاہر ہے اس کے لیے سب سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے تو یہ جانور اپنی دُم کو عام حالت سے زیادہ تیزی کے ساتھ ہلانے لگتا ہے۔ یہ سانپ جیسے جیسے اُس کے قریب آتا جاتا ہے یہ اپنی دُم کو ہلانے کی رفتار بڑھاتا چلا جاتا ہے اس طرح پاکٹ ماٹس کے دوسرے ساتھی اپنے ایک ساتھی کو لاحق خطرے کی نوعیت، سمت، حجم اور فاصلے کا اندازہ کر لیتے ہیں اور پھر متحد ہو کر اپنے دشمن پر حملہ آور ہوتے ہیں۔

ہرنوں کی ایک ڈار سبزے سے بھری وادی میں گھاس چر رہی ہے کہ یکایک ایک ہرن سر اُٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھتا ہے اور اپنے کان کھڑے کر لیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے ہرن نے اپنے دشمن کے قدموں کی آواز سُن لی ہے یا اُس کی بُو سونگھ لی ہے۔ لمحہ بھر میں وہ ہرن اپنی دُم کھڑی کر لیتا ہے۔ باقی ہرن جیسے ہی اُس ہرن کی کھڑی دُم کو دیکھتے ہیں۔ قلانچیں مارتے ہوئے گھنے جنگل میں بھاگ جاتے ہیں۔ اور یُوں دشمن سے اپنی جان بچاتے ہیں۔

آپ نے دیکھا کہ وہ شے جسے ہم بڑی حقیر سمجھتے ہیں کتنے کام کی ہے۔ امید ہے کہ یہ مضمون پڑھنے کے بعد نہ صرف یہ کہ آپ دُم کو حقیر نہیں سمجھیں گے بلکہ اپنے اطراف میں موجود جانوروں کی دُموں کے مشاہدے کے ذریعے یہ بھی معلوم کرنے کی کوشش کریں گے کہ وہ اور کون کون سے کام انجام دیتی ہیں۔ اس کام سے اور کچھ نہیں تو کم ازکم آپ کو مشاہدے کی عادت تو پڑ ہی جائے گی۔ یاد رکھئے دنیا کے اکثر بڑے لوگ مشاہدے کی غیر معمولی صلاحیت کے ذریعے ہی بڑے بنے ہیں!

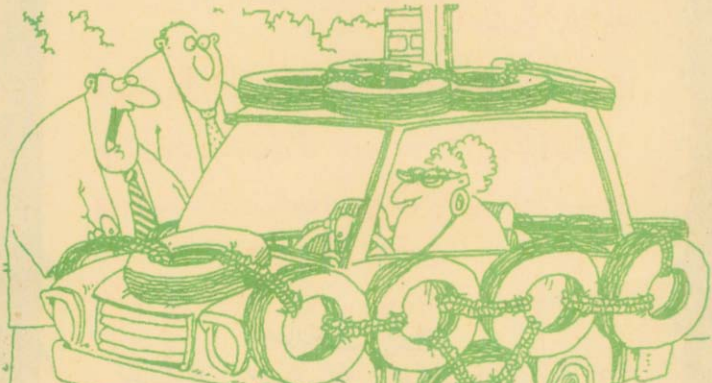

کراچی میں بڑھتے ہوئے حادثات کے پیشِ نظر ضروری ہے کہ آئندہ لوگ اپنی گاڑیوں کو ان محترمہ کے طریقے کے مطابق محفوظ تر بنائیں۔ (سرکاری ترجمان)

خوف کی اِک اور وادی کا سفر
ہو رہا ہے آپ کے اِصرار پر

پہلے سے زیادہ خوفناک کہانیوں، واقعات، حادثات اور مضامین کے جلوس کے ساتھ

آنکھ مچولی کا ایک اور

خوفناک نمبر

جنوری ۱۹۹۰ء میں شائع ہو رہا ہے۔

مگر اس خوفناک نمبر کے لئے آپ بھی تو کچھ لکھئے، مثلاً

- کوئی خوفناک کہانی یا واقعہ،
- کوئی سنسنی خیز نظم یا حادثہ
- دہشت سے متعلق کوئی مضمون
- کوئی دل ہلا دینے والی داستان
- یا کوئی خوفناک تصویر

لفظ لفظ خوف سے تھرتھراتا ہوا۔ حرف حرف ہیبت سے پھڑپھڑاتا ہوا

جلدی کیجئے

خوفناک نمبر کیلئے بے خوف ہو کر لکھئے آنکھ مچولی آپ کی تحریروں کا منتظر ہے

ہر قابلِ اشاعت تحریر کا معاوضہ دیا جائے گا ---

کھٹے میٹھے

انعامی لطیفہ

"محترمہ ڈائٹنگ کرتے وقت احتیاط برتیں، ڈائٹنگ خطرناک بھی ثابت ہوسکتی ہے۔ ایک صاحب نے اپنی شناسا خاتون کو مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

"مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک صاحبہ نے مختصر مدت کی ڈائٹنگ کا پروگرام بنایا' اس وقت اُن کا وزن تین سو پونڈ تھا۔"

"آٹھ ہفتے بعد جب اُن کی ڈائٹنگ کا کورس ختم ہوا تو ان کا وزن صرف پچاسی پونڈ رہ گیا تھا، کفن سمیت۔"

شوکت صدرالدین، کراچی

ڈاکٹر: "مبارک ہو، آپ کے کان کا آپریشن کامیاب رہا۔"

مریض: "کیا کہہ رہے ہیں، زور سے بولیے۔"

طلحہ سلیم۔ گلشن اقبال کراچی

ایک صاحب جب دفتر پہنچے تو اپنی گاڑی پر یہ چٹ لکھ کر لگا گئے: "مہربانی کرکے وہیل کیپ نہ چرائیے۔"

تھوڑی دیر بعد واپس آئے تو چاروں وہیل کیپ زمین پر پڑے تھے اور گاڑی غائب تھی۔

منزہ لیاقت چوہدری، کوٹ ادّو

ایک زرعی کالج کے طالب علم نے باغبان سے کہا "تمہاری باغبانی کے طریقے بہت پُرانے ہیں۔ اگر تمہارے اس درخت سے پانچ سیر سیب بھی پیدا ہوجائیں تو بڑی بات ہوگی۔"

باغبان بولا "حیرت تو مجھے بھی ہوگی۔ اس لیے کہ جس درخت کا آپ ذکر کر رہے ہیں وہ سیب کا نہیں آڑو کا درخت ہے۔"

شہباز غنی، ملتان

ایک خاتون کی گاڑی ایک معروف ترین سڑک کے بیچوں بیچ خراب ہوگئی۔ خاتون نے کافی کوشش کی کہ گاڑی اسٹارٹ ہوجائے، مگر وہ نہ ہوئی۔ اتنے میں خاتون کی گاڑی کے پیچھے گاڑیوں کی ایک لمبی قطار لگ گئی۔ ہارن پہ ہارن بج رہے تھے۔ سب سے زیادہ ہارن خاتون کی گاڑی کے پیچھے کھڑی کار کا ڈرائیور بجا رہا تھا۔ اس پہ خاتون کو سخت غصہ آیا۔ بھنّا کر اپنی گاڑی سے اُتریں اور پچھلی کار کے ڈرائیور کے پاس جاکر بولیں۔

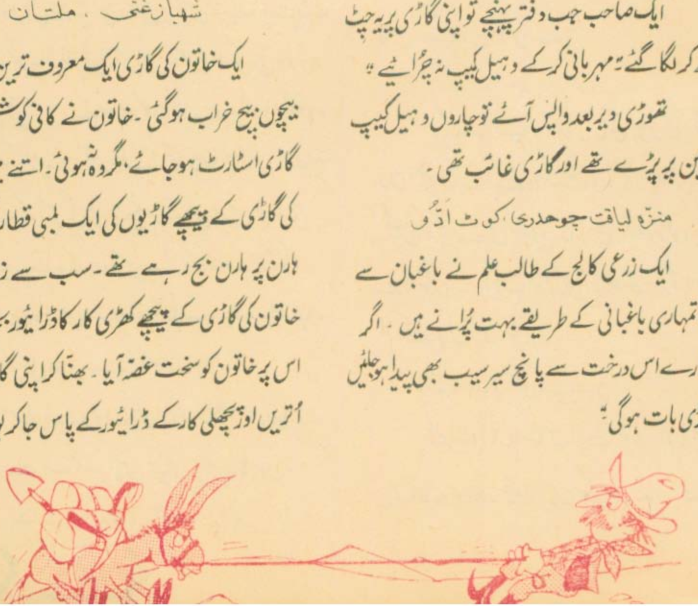

"میں آپ کی گاڑی کا ہارن بجاتی ہوں۔ اتنی دیر میں آپ میری گاڑی اسٹارٹ کر دیں"۔

عادل وحید۔ لیاقت آباد کراچی

اس کی ابتدائی قسطوں کے بارے میں اپنی پردادی سے جاکر پوچھو۔

آثارِ قدیمہ کا ایک ماہر پرانی چیزوں کی تلاش میں شہر شہر گاؤں گاؤں گھومتا پھر رہا تھا۔ ایک چھوٹے سے گاؤں کی چھوٹی سی دکان پر اُس کو ایک بہت پرانے زمانے کا پیالہ نظر آیا جس میں دکان دار کی بلی دودھ پی رہی تھی۔ اس نے سوچا دکان دار سے پیالہ مانگا تو وہ پیالے کی اہمیت سمجھ جائے گا۔ چنانچہ اُس نے بہت اصرار کر کے اُس کی بلی پانچ ہزار روپے میں خرید لی۔ بلی خریدنے کے بعد اُس نے دکاندار سے کہا کہ۔

"یہ پیالہ بھی دے دو۔ تمہارے لیے بیکار ہے اور بلی اس کی عادی ہے"۔ دکاندار بولا۔

"میاں بے وقوف کسی اور کو بنانا اس پیالے کی وجہ سے اب تک بیس بلّیاں بیچ چکا ہوں"۔

بینا غزل، شرف آباد، کراچی

ایک صاحب نے جب ڈاکٹر سے اپنے نہایت خوبصورت کتّے کی دُم کاٹنے کو کہا تو سرجن کو غصّہ آگیا بولا "آخر آپ اس دلکش کتّے کی دُم کیوں کٹوانا چاہتے ہیں؟"

"کل میری ساس ایک ماہ کے لیے ہمارے گھر آرہی ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ میرا کتّا جب انہیں دیکھ کر اپنی دُم ہلائے تو وہ سمجھیں کہ اُن کا استقبال کیا جارہا ہے"۔ اُن صاحب نے جواب دیا۔

ڈیزی تھامس۔ لاہور

دو دوست آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ایک بولا۔ "یار شہر میں آئے دن چوری کی وارداتوں سے تنگ آکر میں نے مجسٹریٹ کو ایک درخواست بھیجی تھی"۔

"پھر کوئی تسلی بخش کارروائی ہوئی؟" دوسرے نے کہا

"کہاں یار! بس ایک چٹھی موصول ہوئی تھی جس پر تحریر تھا۔

"اپنی درخواست دوبارہ بھیجیے آپ کی پہلی درخواست فائل سے چوری ہو گئی ہے"۔

عاصم احمد۔ کوٹری

ایک صاحب کو تصویر بنانی نہیں آتی تھی۔ ایک دن انہوں نے اپنے دوست کی اُلٹی سیدھی لکیریں کھینچ کر عجیب سی تصویر بنا ڈالی۔ تصویر کو دیکھ کر انہوں نے افسوس سے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور کہا "آہ حامد تم کتنے بدل چکے ہو"۔

نائلہ بختیار، کوہاٹ شہر

البرٹ آئن اسٹائن اپنے مشہور نظریۂ اضافت پر مختلف یونیورسٹیوں میں لیکچر دے رہے تھے۔

لیکچر عموماً تیس منٹ کا ہوتا تھا۔ اُن کا شوفر جو اُن کے سب لیکچر سُنتا آرہا تھا۔ ایک روز اُن سے کہنے لگا کہ مجھے آپ کے لیکچر کا ایک ایک لفظ زبانی یاد ہو گیا ہے اور میں بھی لیکچر دے سکتا ہوں۔ آئن اسٹائن مسکرائے اور بولے : "اچھا اگلا لیکچر تم دینا۔ اس یونیورسٹی میں مجھے کوئی پہچانتا بھی نہیں۔"

شوفر نے واقعی صحیح لیکچر دے ڈالا اور اُس کی بہت تعریف ہوئی۔ ہال کے اندر سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا۔ تو پہلا سوال ہی اتنا مشکل تھا۔ کہ شوفر جواب نہ دے سکتا تھا، لیکن وہ ذرا بھی نہ گھبرایا، بولا

"اس قدر آسان سوال، کمال ہے! اس کا جواب تو میرا شوفر بھی دے سکتا ہے۔ میں اُسے بُلا کر لاتا ہوں۔" شوفر نے یہ کہا اور آئن اسٹائن کو حاضرین کے سامنے لا کھڑا کیا۔

رضوان رسول، ساھیوال

ایک شرابی رات گئے شراب کے نشے میں دھت چلا جا رہا تھا کہ ایک سپاہی نے اُسے روک کر پوچھا۔

"آپ کا نام کیا ہے؟"

"مجھے پتا نہیں" شرابی نے انکساری سے جواب دیا۔

"یہ کیا بکواس ہے؟" سپاہی نے گرج کر کہا۔

شرابی کچھ دیر تک سوچتا رہا پھر بولا "آپ شاہراہ نمبر ۴۸ پر جائیں اور کوٹھی نمبر ۱۰ کا کال بجائیں، کوئی نکلے تو اس سے پوچھیں ولیم گھر پر ہے؟ اگر نہ ہو تو سمجھ لو کہ وہ میں ہوں۔"

مار خیل، لورالائی

ایک سیاح ایک گائیڈ کے ساتھ چڑیا گھر کی سیر کر رہا تھا کہ وہ ایک ایسے پنجرے کے پاس پہنچا جس میں شیر اور بکری اکٹھے بندھے ہوئے تھے۔

سیاح حیرت کے ساتھ: "واہ، واہ! پُرامن بقائے باہمی کی ایک اہم مثال، لیکن آخر یہ کس طرح ممکن ہے؟"

گائیڈ: "وہ اس طرح جناب کہ ہم ہر روز ایک نئی بکری اس پنجرے میں ڈال دیتے ہیں۔"

حمیرا عالم۔ راولپنڈی

ایک فلمی ہیرو کو جب ہدایت کار نے شیر کے پنجرے میں داخل ہونے کو کہا تو وہ دہشت سے کانپنے لگا۔ ہدایت کار نے ہیرو کو سمجھاتے ہوئے کہا: "گھبراؤ نہیں یہ پالتو شیر ہے، اسے دودھ پر پالا گیا ہے۔"

ہیرو نے یہ سُن کر کہا "یوں تو ابتدا میں میری پرورش بھی دودھ پر ہوئی تھی مگر میں اب گوشت کھاتا ہوں..."

اعجاز علی شیخ ۔ سکھر

ریڈی میڈ لباس کی دکان پر ایک شخص زردی مائل سوٹ کا بھاؤ تاؤ کرنے میں مصروف تھا۔ دکاندار نے اُسے شیشے میں اُتارنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "جناب اس سوٹ کا رنگ، آپ کے رنگ روپ سے بہت میل کھاتا ہے۔"

اُس شخص نے جل کر کہا "مان لیتا ہوں مگر قیمت معلوم کرنے سے قبل میرا رنگ ایسا نہیں تھا۔"

ساجد کمالوی ۔ کمالیہ

وسیم: "مجھے حساب کے اُستاد بہت پسند ہیں۔"

نعیم: "وہ کیوں؟"

وسیم: "اس لیے کہ وہ مجھے بات بات پر کلاس سے نکال دیتے ہیں۔"

عذرا ناز ۔ میٹرو وِل ۔ کراچی

صدر لنکن سے اُن کے دوست نے پوچھا "ایک آدمی کی ٹانگوں کی اوسط لمبائی کتنی ہونی چاہیے؟"

صدر نے جواب دیا: "کم از کم اتنی کہ اُس کی ٹانگیں زمین تک پہنچ سکیں۔"

فائزہ کریم ۔ لاہور

آپ کی خصوصی توجّہ کے لئے

- ہم نے آپ کی ذہانت آزمانے کے لئے بے نُقط لطائف کے مقابلے کا اعلان اس شمارے میں کیا ہے۔ تفصیلات علیحدہ صفحے پر موجود ہیں۔ تلاش کیجئے اور بغور پڑھئے۔

- ساتھی جس صفحے پر لطیفہ بھجوائیں اس پر اپنا نام و پتہ ضرور درج کریں تاکہ انعام بھجوانے میں دقت نہ ہو۔

چھلکے

محمّد جاوید خالد

کہیں سے اک اخروٹ کوّے نے پایا — خیال اس کو پھر توڑنے کا بھی آیا
بہت اس نے کیں کوششیں توڑنے کی — پر اخروٹ ٹوٹے کبھی چونچ سے بھی؟
گلہری نے کوّے کو دیکھا تو بولی — "اُٹھاتے ہو تکلیف کیوں آخر اتنی"
کہا پھر گلہری سے کوّے نے ایسے — "میں حیراں ہوں آخر یہ ٹوٹے گا کیسے؟
گماں ہے کہ ہوگی مزے کی بہت شے — کیا بند جب ہی خدا نے اسے ہے
اسے کھولنے میں مشقّت کڑی ہے — تو اندر ضرور اس کے نعمت بڑی ہے
مَیں توڑوں گا اس کو ہو جیسے بھی ممکن" — گلہری یہ بولی "لگیں گے کئی دن
کیا اس نے بے حد پریشان تم کو — بتاؤں میں تدبیر آسان تم کو
فضا میں اسے لے کے جاؤ یہاں سے — چٹانوں دے مارنا پھر وہاں سے
خود اپنی ہی ضرب اس کو توڑے گی آخر — مزے لے کے کھانا اسے شوق سے پھر"
کیا یوں ہی کوّے نے، اخروٹ ٹوٹا — مگر نیچے آکر تماشا یہ دیکھا
گری سب گلہری نے اس کی اُڑالی — پڑے رہ گئے تھے وہاں چھلکے خالی
یہ منظر جو دیکھا تو کوّے نے سوچا — نہ لالچ نے مجھ کو کہیں کا بھی رکھا
اگر چند ہوتے یہاں میرے ساتھی — گلہری کی ہمّت تھی؟ اخروٹ کھاتی
نہ لالچ اکیلے ہی کھانے کا آتا — نہ اخروٹ ہاتھوں سے اس طرح جاتا
جو کرتے ہیں لالچ نہیں کھاتے مل کے — تو آتے ہیں بس ان کے حصّے میں چھلکے

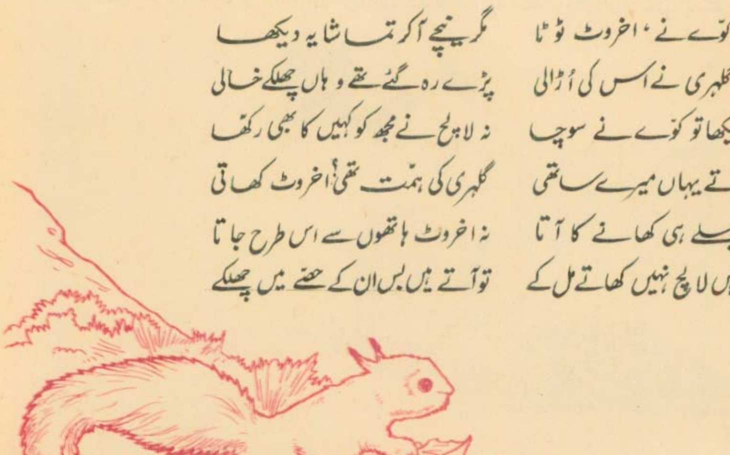

مقابلۂ کارٹون

قارئین کی نظر میں ادارہ آنکھ مچولی کے ارکان

کیا ہم واقعی ایسے ہیں ؟

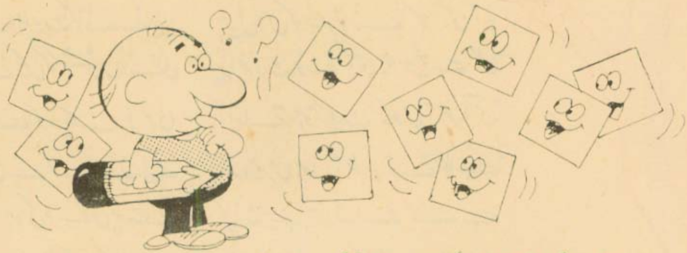

ہم نے گزشتہ ماہ آپ کو دعوت دی تھی کہ ہمارا کارٹون بنائیے ۔ اس دعوت کے جواب میں لاتعداد کارٹون ملے مگر اکثر کارٹون یا تو موضوع سے ہٹ کر تھے یا پھر پینسل سے بنائے گئے تھے ۔ جن کی اشاعت ممکن نہ تھی ۔ چند منتخب کارٹون ہم یہاں شائع کر رہے ہیں اور تین بہترین کارٹون پر کتب کے انعامات بھی دے رہے ہیں ۔

۳ ۔ انعامات کے حق دار

پہلا انعام :۔ (نام و پتہ نہیں لکھا) ۔ کراچی

دوسرا انعام :۔ محمد انجم مبین ۔ ڈیرہ اسماعیل خان تیسرا انعام :۔ وسیم عباس شیخ ۔ سیالکوٹ

شہزاد رضا ، کراچی ۔ ناصر محمد ، ہنگو اور محمد صاحب کے کارٹون پسند آئے مگر مدھم لائن ورک کی وجہ سے شائع نہیں کئے جاسکے ۔

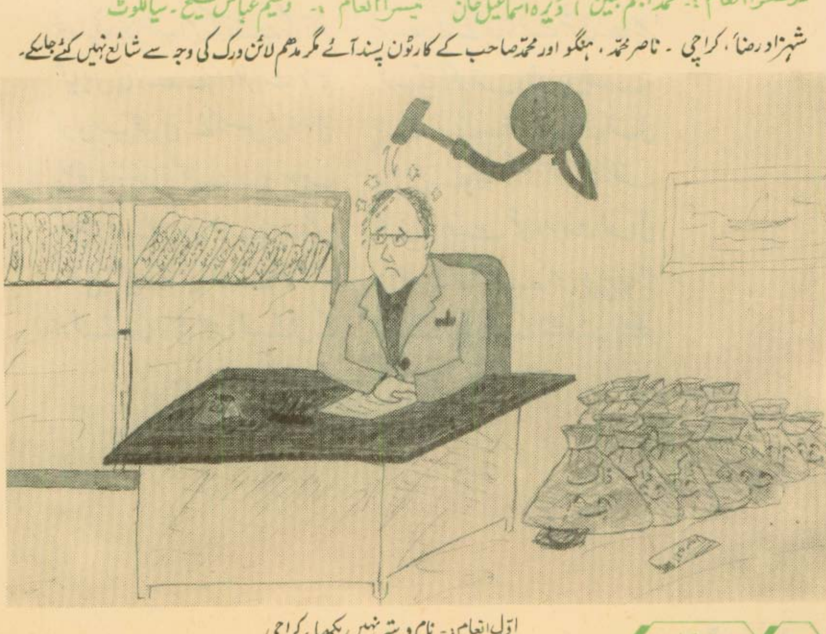

اوّل انعام :۔ نام و پتہ نہیں لکھا ۔ کراچی

(نام نہیں لکھا)

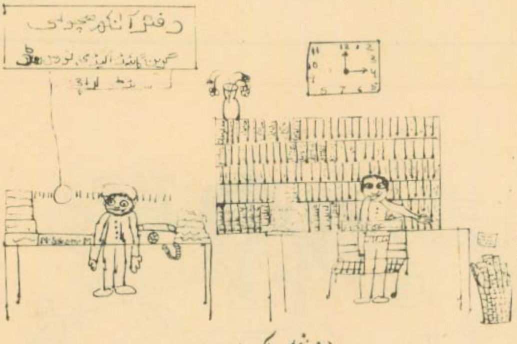

(نام نہیں لکھا)

تاخیر سے ملنے والے
کارٹون میں سے
منتخب کارٹون
دسمبر کے شمارے میں
شائع کئے جائیں
گے
(ادارہ)

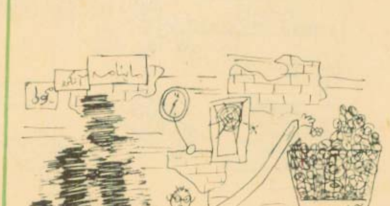

ایم آصف

دوسرا انعام :- محمد انجم مبین ۔ ڈیرہ اسماعیل خان

تیسرا انعام وسیم عباس شیخ سیالکوٹ

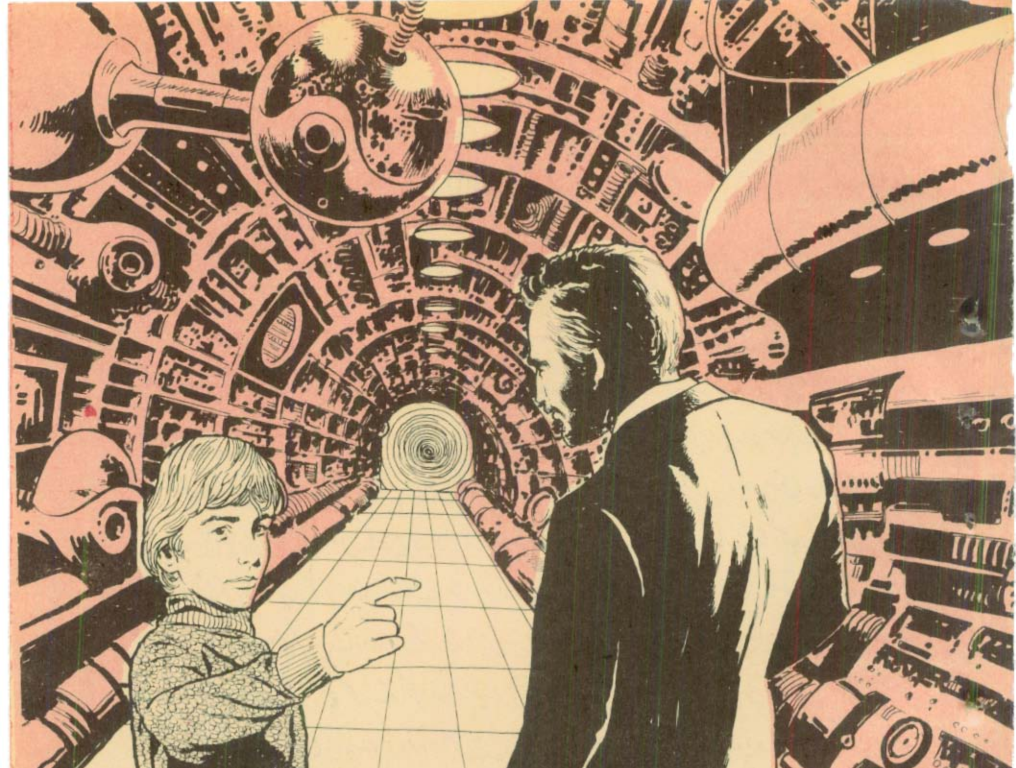

سائنسی دنیا کی دلچسپ کہانی

ماضی کا داغ

عمران مشتاق

"فوری ضرورت ہے"

"چند ایسے افراد کی فوری ضرورت ہے جنھیں اپنے رسک پہ دنیا گھومنے کا شوق ہو۔ جلد از جلد رجوع کریں۔ منتخب افراد کو معقول معاوضہ دیا جائے گا۔" شجاع کو یہ اشتہار بہت عجیب لگا۔ "کیا یہ میرے مسئلے کا حل

ہوسکتا ہے۔" اُس نے سوچا "کوشش کرنے میں کوئی حرج نہیں" ذہن نے سمجھایا۔ اُس نے اشتہار کے نیچے دیا ہوا پتہ ایک کاغذ پہ لکھ لیا۔ "اگر ویسا ہی نکلا جیسا کہ میں سوچ رہا ہوں تو..." اُس کے جسم میں ایک عجیب سی سنسناہٹ ہونے لگی۔

اپنے کمرے میں داخل ہونے والے اُس بارہ تیرہ سالہ لڑکے کو پروفیسر عظمت علی نے بڑی دلچسپی سے دیکھا وہ ان کی میز کے دوسری طرف رکھی کُرسی پہ بڑے اعتماد کے ساتھ آکے بیٹھ گیا تھا۔ پروفیسر ابھی تھوڑی ہی دیر پہلے بیس اکیس نوجوانوں کا انٹرویو کرکے فارغ ہوئے تھے۔ صرف دو ہی نوجوان ان کے مطلب کے نکلے تھے۔

"بیٹے! تمہیں مجھ سے کوئی کام ہے؟" انھوں نے شفقت سے پوچھا "آپ پروفیسر عظمت علی ہیں نا؟" اُس نے تصدیق چاہی۔ اُن کے ہاں کہنے پر وہ بولا "میں آپ کا اشتہار پڑھ کر آیا ہوں۔ آپ کا اشتہار کچھ عجیب وغریب سا ہے۔" "لیکن وہ اشتہار تو نوجوانوں کے لیے تھا۔ تم تو ابھی بچے ہو۔ تمہارا اُس سے بھلا کیا تعلق ہوسکتا ہے..." پروفیسر اُس کی بات سُن کر حیرت زدہ رہ گئے تھے "میں بچہ نہیں ہوں ساتویں کلاس میں پڑھتا ہوں اور میرا نام شجاع ہے۔ انکل آپ لوگ ہمیں بچہ سمجھ کے نظر انداز نہ کیا کریں۔ بہت سی باتوں کو ہم بھی اسی طرح محسوس کرتے ہیں جس طرح آپ بڑے" شجاع کی بات سُن کر وہ اُس میں دلچسپی لینے پر مجبور ہوگئے۔ اچانک پروفیسر کے ذہن میں آیا کیوں نہ لڑکے کا امتحان لیا جائے۔ وہ بولے "اچھا اگر تم بچے نہیں ہو تو اس اشتہار کا مطلب بتادو۔ اگر تم بتانے میں کامیاب ہوگئے تو میں تمہیں بچہ نہیں سمجھوں گا۔"

"انکل میں جاسوسی ناول بہت پڑھتا ہوں اس لیے میرا ذہن کہتا ہے کہ آپ نے یہ اشتہار کچھ مخصوص آدمیوں کے لیے شائع کروایا ہے۔ میرا مطلب ہے اس اشتہار میں اُن کے لیے کچھ خفیہ اشارے ہیں۔ دوسری بات جو میرے ذہن میں آتی ہے اور جس کا امکان زیادہ ہے وہ یہ ہے کہ چونکہ آپ بہت بڑے سائنس دان ہیں۔ اس لیے ہوسکتا ہے کہ آپ نے کوئی ایسی ایجاد کی ہو جو مختلف زمانوں کی سیر کراسکتی ہو۔" وہ سوچ میں گُم لہجے میں بولا۔ اور پروفیسر وہ حیرت سے اُس کی جانب دیکھ رہے تھے۔ "تمہاری ذہانت کی میں قدر کرتا ہوں۔ تم کافی حد تک صحیح اندازہ لگانے میں کامیاب ہوگئے ہو۔ تمہارا دوسرا اندازہ صحیح ہے۔ میں اپنی اس ایجاد کو ابھی دنیا سے چھُپا کر رکھنا چاہتا ہوں۔ اس لیے میں نے یہ انداز اختیار کیا ہے۔ دراصل میں نے ٹائم مشین جیسی ایک مشین ایجاد کی ہے۔ ٹائم مشین ابھی تصوراتی شے ہے۔ لیکن میری یہ مشین اب ایک زندہ حقیقت ہے۔ یہ تصوراتی ٹائم مشین کی طرح ہر زمانے کا سفر نہیں کرسکتی بلکہ یہ صرف ماضی میں جاسکتی ہے۔ اس لیے میں نے اس کا نام "پاسٹ ایکسپلورر مشین (ماضی کو کھوجنے والی) رکھا ہے۔ اسے تم مختصراً PE مشین بھی کہہ سکتے ہو۔ ویسے

ٹائم مشین کے متعلق تمہیں کچھ علم تو ضرور ہوگا :" پروفیسر نے اپنی ایجاد کی تفصیل بتاتے ہوئے آخر میں اُس سے پوچھا :" جی ہاں ٹائم مشین پر میں نے کئی کہانیاں پڑھی ہوئی ہیں :" شجاع جلدی سے بولا:" تو اس کا خیال درست تھا :" اس نے مطمئن ہوتے ہوئے سوچا۔" اپنی مشین کو میں اب تک تجرباتی جانوروں کے ساتھ کئی بار ماضی میں بھیج چکا ہوں۔ لیکن کسی انسان کو بھیجنے کا ابھی تجربہ نہیں کیا۔ یہ اشتہار میں نے اسی مقصد کے لیے شائع کروایا تھا۔ اپنے مطلب کے صرف دو افراد مجھے ملے ہیں۔ انھوں نے بھی اپنی ذہانت سے اصل بات بتادی تھی۔ اس لیے میں نے اُنھیں منتخب کرلیا۔ وہ دونوں ماضی میں جانے کے لیے بخوشی تیار ہیں۔ وہ دونوں کل صبح آئیں گے۔ تو میں اُنھیں ماضی میں بھیجوں گا اور پھر اُن کے مشاہدات کو اپنی ڈائری میں درج کروں گا۔ میں خود بھی ماضی میں جانا چاہتا ہوں۔ لیکن مشین کی کارکردگی کا مکمل اطمینان کیے بغیر میں خطرہ مول نہیں لے سکتا :" پروفیسر نے بتایا " انکل میں بھی ماضی میں جانا چاہتا ہوں۔ مجھے معاوضہ نہیں چاہیے۔ بس آپ مجھے ۵۸ برس پہلے کے لاہور میں بھیج دیں"۔ اس نے اپنے جوش کو چھپاتے ہوئے کہا:" نہیں یہ ناممکن ہے اگر مشین میں کوئی خرابی ہوگئی تو ہمیشہ کے لیے وہیں رہ جاؤ گے۔ میں تمہیں کبھی نہیں بھیجوں گا :" پروفیسر نے نفی میں سر ہلایا:" انکل آپ اُن دو آدمیوں کو بھی تو بھیج رہے ہیں۔ مشین خراب ہونے پر وہ دونوں بھی تو وہاں رہ سکتے ہیں :" ہاں ایسا ممکن ہے۔ لیکن وہ عُمر میں تم سے کافی بڑے ہیں۔ اگر کسی مشکل سے دوچار ہو بھی گئے تو وہ اپنی حفاظت خود کرسکتے ہیں ویسے بھی اپنے فعل کے وہ خود ذمے دار ہوں گے۔ لیکن تم --- ہرگز نہیں۔ میں ایسا رِسک نہیں لے سکتا :"

" انکل میرا جانا بہت ضروری ہے۔ مجھے دادا پر لگا وہ داغ ضرور دھونا ہے۔ مجھے ضرور بھیجیں۔ اچھا ایسا کریں، ان دونوں کو کئی بار بھیج کر دیکھ لیں۔ اگر مشین کوئی خرابی ظاہر نہ کرے تو پھر بعد میں آپ مجھے بھیج دیجیے گا " اُس نے تجویز پیش کی :" ہُوں ٹھیک ہے۔ میں سوچوں گا۔ تم ایک ہفتے بعد آنا اور ہاں سنو۔ میرا خیال ہے تمہیں یہ بتانے کی ضرورت تو نہیں ہے کہ اس مشین کا ذکر تم کسی سے نہیں کروگے :" وہ اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولے۔

" نہیں انکل میں کسی سے ذکر نہیں کروں گا۔ میں اب ایک ہفتے کے بعد آؤں گا " واپس جاتے ہوئے وہ بے حد خوش تھا کہ اُس نے پروفیسر کو راضی کرلیا ہے۔ ورنہ اُسے ڈر تھا کہ شاید پروفیسر صاحب نہ مانیں۔

"ہوں تو تم نہیں مانے :" پروفیسر نے شجاع کو دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ اُن کے ملاقاتی کمرے میں پہلے جیسے اعتماد کے ساتھ ہی داخل ہوا تھا " اب تم آہی گئے ہو تو آؤ میرے ساتھ میں تمہیں اپنی تجربہ گاہ دکھاتا ہوں " پروفیسر کے پیچھے پیچھے وہ اُن کی وسیع وعریض تجربہ گاہ میں داخل ہوگیا۔ تجربہ گاہ کو دیکھتے ہی اُس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ تجربہ گاہ عجیب وغریب آلات سے سجی ہوئی تھی۔ پروفیسر ایک عجیب وغریب مشین کے سامنے جاکر کھڑے ہوگئے

تھے۔ اُسے دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے وہ لفٹ کا کمرہ ہو لیکن عام لفٹ کے مقابلے میں یہ بہت چھوٹی تھی۔ بمشکل سے اتنی جگہ ہوگی کہ ایک آدمی اس میں بیٹھ سکے "میں بڑی کامیابی سے ان دونوں نوجوانوں کو کئی بار ماضی کی سیر کرا چکا ہوں۔ اب میں PE مشین کی کارکردگی سے پوری طرح مطمئن ہوں اب میں اپنی اس ایجاد کو جلد ہی دنیا کے سامنے لے آؤں گا۔ میں تمہیں خبردار کرتا ہوں کہ اب بھی کسی قسم کا خطرہ پیش آسکتا ہے۔ تم اپنی ضد سے باز آجاؤ" پروفیسر نے اُسے آخری بار سمجھانے کی کوشش کی "نہیں انکل مجھے ضرور جانا ہے۔ دادا پہ لگا وہ داغ میں ضرور مٹا کے رہوں گا" وہ خواب کی کیفیت میں بولا "داغ کیسا داغ۔ کچھ وضاحت کرو" "پہلے آپ مجھے بھیج دیں۔ واپس آکر میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گا" "اچھا چلو بتاؤ کہاں جانا ہے؟" "مجھے آج سے اٹھاون برس پہلے کے لاہور جانا ہے۔ یعنی ۲۷ مئی ۱۹۳۱ء سہ پہر چار بجے سے پہلے پہلے" اُس نے بتایا۔ پروفیسر نے اُس کی بات حیرت سے سُنی۔ پھر کچھ بولے بغیر انتظامات میں لگ گئے "اب PE مشین سفر کے لیے بالکل تیار ہے تم صرف آدھا گھنٹہ ماضی میں رہ سکتے ہو۔ آدھے گھنٹے کے ختم ہونے سے پہلے ہی تمہیں اس بٹن کو دبانا ہے۔ تمہارا واپسی کا سفر شروع ہو جائے گا" پروفیسر نے اُسے ایک گھڑی جیسی چیز دیتے ہوئے کہا۔ اُس پہ رنگ برنگے بٹن لگے ہوئے تھے۔ پھر وہ اُسے کافی دیر تک ضروری باتیں سمجھاتے رہے۔ PE مشین میں سوار ہوتے وقت شجاع کے ہاتھ میں نیلے رنگ کا ایک چھوٹا سا بیگ تھا "محتاط رہنا اور میری ہدایات پہ پوری طرح عمل کرنا۔ ایک بات یاد رکھو۔ تم اپنی کوشش ضرور کرو لیکن ماضی بدلا نہیں جا سکتا۔ ٹھیک ہے اب جاؤ۔ اللہ حافظ" پروفیسر کی بات ختم ہونے کے چند لمحوں بعد PE مشین تجربہ گاہ سے غائب ہو چکی تھی۔ وقت گزارنا پروفیسر کے لیے دشوار ہو گیا۔ وہ دل ہی دل میں شجاع کی سلامتی کی دُعائیں کرنے لگے۔ ۲۵ منٹ بعد PE مشین تجربہ گاہ میں واپس پہنچ چکی تھی۔ پھر شجاع مُسکراتا ہُوا اُس میں سے باہر نکل آیا۔ اُسے دیکھتے ہی پروفیسر کی جان میں جان آئی "اللہ کا شکر ہے تم خیریت سے واپس آگئے۔ درحقیقت میں بہت پریشان تھا۔ ہاں اب ذرا مجھے ساری کہانی سناؤ۔ تجسس کے مارے میرا بُرا حال ہے" پروفیسر ایک کرسی پہ بیٹھتے ہوئے بولے۔ شجاع ان کے سامنے دوسری کرسی پہ بیٹھ گیا "انکل میں اپنے دادا جان سے بہت محبت کرتا ہوں۔ وہ ہیں ہی بہت اچھے وہ ہمیشہ ہنستے بولتے رہتے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی اُداس بھی ہو جاتے ہیں۔ اور یہ اُداسی اُن پر کافی دیر تک طاری رہتی ہے۔ وہ اپنی اُداسی کی وجہ کسی کو نہیں بتاتے۔ ایک دن میں نے بہت مجبور کیا تو بڑی مشکل سے بتانے پر راضی ہوئے۔ یہ آج سے اٹھاون برس پہلے کی بات ہے۔ ان کا پڑوسی جعلی کرنسی کا کاروبار کرتا تھا۔ اُس نے دادا کو بھی اپنے کاروبار میں شامل کرنے کی کوشش کی۔ دادا نے نہ صرف اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا بلکہ اُسے دھمکی بھی دی کہ اگر اُس نے اپنا کاروبار ختم نہ کیا تو وہ پولیس کو بتا دیں گے۔ ایک دن کسی نے مخبری کر دی۔ پولیس دادا کے پڑوسی کے گھر پہنچ گئی۔ اُسے پہلے ہی

پتا چل گیا تھا اُس نے سارے جعلی نوٹ ایک تھیلے میں بھر کر دادا کے گھر میں چھپا دیے۔ دادا کو اس بات کا پتا ہی نہ چل سکا۔ وہ آدمی پولیس کو لے کر دادا کے گھر پہنچا اور پولیس انسپکٹر سے کہا کہ اُنھیں کسی نے غلط اطلاع دی ہے جعلی کرنسی کا کام وہ نہیں دادا کرتے ہیں۔ گھر کی تلاشی لینے پر جعلی نوٹوں سے بھرا ہوا تھیلا مل گیا... دادا نے بہت منتیں کیں لیکن ہندو انسپکٹر نے اُن کی ایک نہ سُنی البتہ ایک بات کہی اگر دادا اُسے ہزار روپے دے دیں تو وہ انھیں گرفتار نہیں کرے گا اور نہ ہی کیس بنائے گا۔ ہزار روپے اُس وقت بہت بڑی رقم تھی... دادا کے پاس تو سو روپے بھی نہ تھے۔ وہ کہاں سے دیتے۔ پولیس اُنہیں پکڑ کر لے گئی۔ بے گناہ ہونے کے باوجود دادا کو تین سال قید بھگتنا پڑی۔ پاکستان بننے کے بعد دادا کافی خوشحال ہو گئے۔ لیکن رُسوائی کا وہ داغ وہ اب تک نہیں بھُول سکے۔ جب بھی وہ اُس وقت کو یاد کرتے ہیں تو اُداس ہو جاتے ہیں لیکن اب وہ اُداس نہیں رہیں گے کیونکہ میں نے اس داغ کو مٹانے کا سارا انتظام کر دیا ہے۔" شجاع کے دادا کی کہانی سننے کے بعد پروفیسر نے پوچھا "اور تم نے کیا انتظام کیا ہے؟" "یہ میں آپ کو کل بتاؤں گا۔ جب میں ایک بار پھر ماضی کا سفر کروں گا۔ واپس آکر میں دادا کو بتاؤں گا کہ ماضی کا داغ مِٹ گیا ہے۔" "ٹھیک ہے تم کل آکر ایک بار اور ماضی کی سیر کر آنا اور یہ تمہارا PE مشین سے آخری سفر ہوگا اس کے بعد میں تمہیں کبھی نہیں بھیجوں گا۔" "اُس کے بعد مجھے جانے کی ضرورت بھی نہیں رہے گی۔"

"میں ایک بار پھر کہوں گا کہ تمہاری یہ کوشش فضول ثابت ہوگی ماضی گزرا ہوا وقت ہے کسی کے بس میں نہیں کہ اُسے تبدیل کر دے۔" "لیکن میں تو اُسے بدل چُکا ہوں۔" شجاع نے مضبوط لہجے میں کہا اور پروفیسر اُس کی جانب ایسی نظروں سے دیکھنے لگے جیسے اس نے کوئی نادانی کی بات کر دی ہو۔

اگلے دن شجاع نے محسوس کیا کہ پروفیسر کچھ چُپ چُپ سے ہیں۔ "بیٹھو۔" پروفیسر ایک کُرسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولے "مجھے تمہارے معاملے سے اتنی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی کہ میں انتظار نہیں کر سکا کہ تم آؤ۔ ماضی کا سفر طے کرو۔ اور پھر میں تم سے ساری بات سُنوں۔ اس لیے میں نے پہلی بار PE مشین کو استعمال کیا۔ میں تمہارے دادا کے گھر اُس وقت پہنچا جب پولیس تلاشی لے رہی تھی۔" پروفیسر نے دھیمے لہجے میں کہا "آپ وہاں ہو بھی آئے تو پھر کیا دیکھا آپ نے۔ پولیس انسپکٹر نے میرے دادا کو چھوڑ دیا ہوگا۔ وہ اُن سے بڑی عزت سے پیش آیا ہوگا۔ کیوں میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟" اُس نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔ "نہیں انسپکٹر نے اُنہیں نہیں چھوڑا۔ میں جب پہنچا تو تمہارے دادا انسپکٹر کی منتیں کر رہے تھے کہ وہ اُنھیں چھوڑ دے وہ بے قصور ہیں یہ جعلی نوٹ اُن کے نہیں ہیں۔ اُن کے پڑوسی نے اُنہیں پھنسانے کی کوشش کی ہے۔" ایک شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تمہارے دادا نے انسپکٹر کو

یقین دلانے کی کوشش کی۔ وہ شاید اُن کا پڑوسی تھا۔ لیکن انسپکٹر اُن کی کوئی بات نہیں سُن رہا تھا۔ ابھی دونوں میں گفتگو جاری ہی تھی کہ ایک سپاہی تمہارے دادا کے گھر سے نکلا۔ اُس کے ہاتھ میں وہ ہی نیلے رنگ کا چھوٹا سا بیگ تھا۔ جو تم دادا کی مدد کے لیے رکھ آئے تھے تاکہ دادا بیگ میں موجود ہزار روپے انسپکٹر کو دے کر چھوٹ سکیں۔ بیگ اُس نے انسپکٹر کو دے دیا۔ انسپکٹر نے جیسے ہی اُسے کھولا چھن کی آواز کے ساتھ کئی سکّے نیچے زمین پر گر گئے۔ اُس نے بیگ میں ہاتھ ڈال کر نکالا تو اُس کے ہاتھ میں کئی نوٹ اور کچھ سکّے تھے۔ وہ کافی دیر تک اُنہیں غور سے دیکھتا رہا۔ وہ بہت زیادہ حیران لگ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اُلجھن آمیز لہجے میں بولا: "یہ تو کسی ایسے ملک کی کرنسی ہے جس کا دنیا میں کوئی وجود ہی نہیں۔ یہ بات جتنی عجیب ہے اُتنی خطرناک بھی، تم تو بہت بڑے مجرم لگتے ہو۔ یقیناً تمہارا تعلق کسی بڑے گروہ سے ہے۔ چنکی داس اسے فوراً ہتھکڑی لگاؤ۔ یہ خطرناک مجرم ہے۔ انسپکٹر نے ایک کانسٹیبل کو اشارہ کیا۔" پروفیسر خاموش ہو گئے: "ماضی کو بدلنا ممکن نہیں، البتہ حال ہمارے بس میں ہے ہم محنت کر کے اسے ضرور اپنے لیے خوشگوار بنا سکتے ہیں۔" وہ دھیرے سے بڑبڑائے۔

میرا گڈا پیارا پیارا • سچ مچ میرا راج دُلارا

پہیلی

اُلٹا بیس

پروفیسر عنایت علی خان

خوش ذائقہ اور خوش رنگ ہُوں میں — کاٹو تو سراسر زنگ ہُوں میں
ہوں زرد، ہرا اور لال بھی ہُوں — فولاد سے مالا مال بھی ہُوں
خوش رنگ بھی ہے اور خُوش بُو بھی — گو بھائی میرا آڑو بھی!
پر تُرشی اس کی بات میں ہے — شیرینی میری ذات میں ہے
یہ کس نے کہا اُنیس ہُوں میں — سارے پھلوں میں بیس ہُوں میں
اور بیس ہی میرا کام بھی ہے — اُلٹو تو میرا نام بھی ہے
جاں کھاتے ہو خُون پیتے ہو — تم میرے بل پر جیتے ہو
گر مجھ کو کچّا کھاؤ گے! — جی میں بیحد پچھتاؤ گے
منہ بھی کھٹّا ہو جائے گا — اور پیٹ مروڑیں کھائے گا
ہاں پک جاؤں تب کھا جانا — بازار میں لینے آجانا
میں کیا ہوں یہ بتلاؤ تم! — پھر خوب مزے سے کھاؤ تم

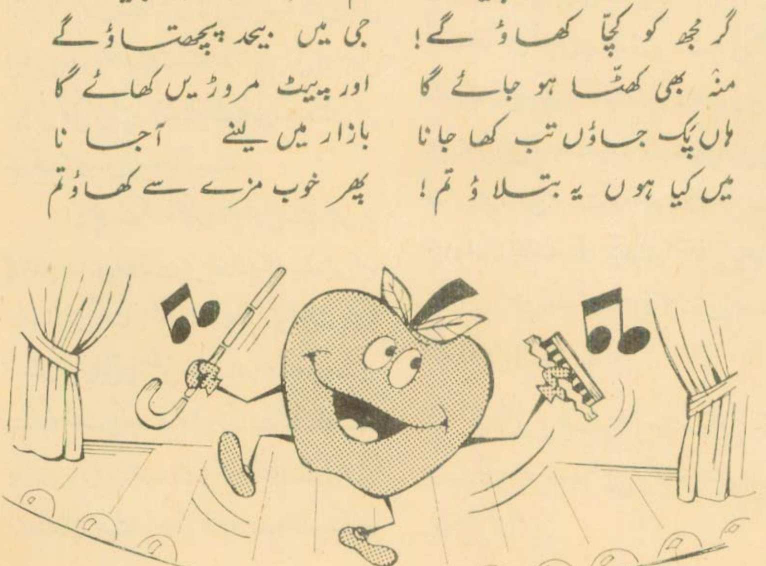

محمد صالح ارشاد

مائیکرو واوون

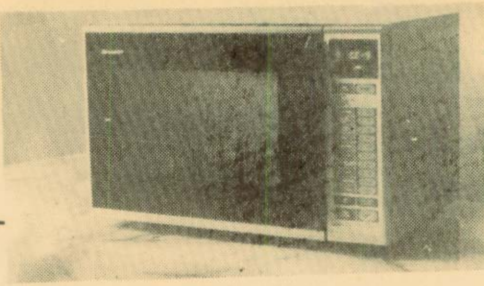

سائنس کے حوالے سے کی جانے والی حیرت انگیز ایجادات اور ترقی کے بارے میں تو آپ پڑھتے ہی رہتے ہوں گے۔ آج کل ایسی ایسی ایجادات سامنے آرہی ہیں کہ جنہیں دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ سائنس کی بے شمار حیرت انگیز ایجادات میں سے آج ہم آپ کو ایک ایسے چولہے کے بارے میں بتا رہے ہیں، جس کے بارے میں آپ یہ سُن کر حیران ہوں گے کہ اس میں گیس کے عام چولہوں کی طرح نہ کوئی شعلہ ہوتا ہے اور نہ ہی برقی چولہوں کی طرح کوئی ہیٹر یا ہاٹ پلیٹ ہوتی ہے لیکن پھر بھی کھانا جلدی پک جاتا ہے۔

اس چولہے کو مائیکرو ویو اوون کہتے ہیں۔ یہ چولہا بہت ہی کم وقت میں کھانا پکا دینے میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ مثلاً ایک سالم مُرغی صرف پندرہ منٹ میں پکائی جا سکتی ہے۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ گوشت یا کھانے کو فریزر سے نکالنے کے بعد اس پر موجود برف وغیرہ بھی پگھلانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کا کام صرف اتنا ہے کہ آپ کھانا فریزر سے جمی ہوئی حالت میں نکالیں اور مائیکرو ویو اوون کے سپُرد کردیں۔

یہ سب کیوں اور کس طرح ہُوا، آئیے ہم آپ کو بتائیں۔

۴۸ سال پہلے برطانیہ کے دو سائنسدانوں نے ایک ایسا آلہ ایجاد کیا۔ جو بہت زیادہ فریکوئنسی کی حامل ریڈیائی لہریں خارج کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ ان لہروں پر بعد میں ہونے والی تحقیق کے نتیجے میں یہ بات سامنے آئی کہ جب یہ لہریں پیدا ہوتی ہیں تو بہت زیادہ حرارت پیدا کرتی ہیں۔ اور اس غیر معمولی حرارت کو دوسرے کاموں کے علاوہ کھانا پکانے کے لیے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس اصول کے تحت ۱۹۵۳ء میں پہلا مائیکرو ویو اوون ایجاد ہُوا۔

ابتدا میں یہ چولہے صنعتی مقاصد میں استعمال ہوئے لیکن پھر ۱۹۶۰ء میں یہ گھریلو استعمال کے لیئے پیش کیا گیا۔

مائیکرو ویواون میں کھانا پکانے کے لئے بہت زیادہ فریکوئنسی کی حامل ریڈیائی لہروں سے مدد لی جاتی ہے ۔ ان لہروں کو مائیکرو ویوز کہا جاتا ہے ۔

ایک آلہ جس کو میگنیٹرون کہا جاتا ہے کی مدد سے یہ لہریں پیدا کی جاتی ہیں ۔ مائیکرو ویوز چولہے میں چاروں طرف پھیل جاتی ہیں اور چولہے کے مرکز میں رکھی ہوئی غذا میں جذب ہونا شروع ہو جاتی ہیں ۔ جب یہ غذائیں جذب ہوتی ہیں تو کیا ہوتا ہے ؟ اس بات کو سمجھنے کے لیے ہم ایک مُرغی کو بطور مثال لیتے ہیں ۔

مُرغی یا کسی بھی غذا میں لاتعداد مالیکیول یا سالمے موجود ہوتے ہیں ۔ جو اِدھر اُدھر پھیلے ہوتے ہیں ۔ ہر مالیکیول پر مثبت اور منفی چارج ہوتا ہے ۔ جب مائیکرو ویوز ان مالیکیول سے گزرتی ہیں تو یہ تمام مالیکیولز اپنے مقناطیسی میدان کے متوازی رہتے ہوئے ایک لائن میں آجاتے ہیں ۔

دوسری مائیکرو ویوز ان مالیکیولوں کو اُلٹ دیتی ہے ۔ ایک سیکنڈ میں یہ مالیکیولز ایک بلین یعنی ایک کروڑ مرتبہ اُلٹ پلٹ ہوتے ہیں ۔ جس کی وجہ سے یہ آپس میں رگڑ کھاتے ہیں اور نتیجتاً بہت زیادہ حرارت پیدا کرتے ہیں ۔

اس بات کو آسانی سے یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ اگر آپ سردیوں میں اپنی دونوں ہتھیلیوں کو آپس میں رگڑیں تو ہتھیلیاں گرم ہو جاتی ہیں یہ گرمی رگڑنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے ۔ اس طرح مالیکیولز جب اُلٹ پلٹ ہونے کی وجہ سے آپس میں رگڑ کھاتے ہیں تو گرمی پیدا ہوتی ہے اور کھانا بجائے باہر سے پکنے کے اندر سے پکنا شروع ہو جاتا ہے ۔

چونکہ مائیکرو ویوز کھانے کے ہر حصے میں یکساں طور پر جذب ہوتی ہیں اس لیے کھانا اندر اور باہر سے یکساں طور پر پک کر تیار ہو جاتا ہے ۔

مرغی میں مثبت اور منفی چارج کے حامل مالیکیول ہر طرف پھیلے ہوتے ہیں ۔

مائیکرو ویو کی پہلی لہر ان مالیکیولز کو ان کے مقناطیسی میدان کے متوازی رکھتے ہوئے ایک سیدھ میں کر دیتی ہے ۔

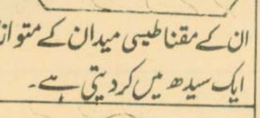

دوسری لہر ان کو اُلٹ دیتی ہے ۔ یہ اُلٹ پلٹ ایک سیکنڈ میں ایک کروڑ مرتبہ ہوتی ہے ۔

مائیکرو ویو اون میں ٹائمر کی سہولت بھی ہوتی ہے ۔ مختلف کھانوں کے لئے مختلف وقت مقرر ہے ۔ کھانے کی مناسبت سے وقت مقرر کر دیں مقرر کردہ وقت پر کھانا پک کر تیار ہو جاتا ہے ۔ اور مائیکرو ویو خود بخود بند ہو جاتا ہے ۔

سلمان غزالی

مادام تساؤ کے شہر میں

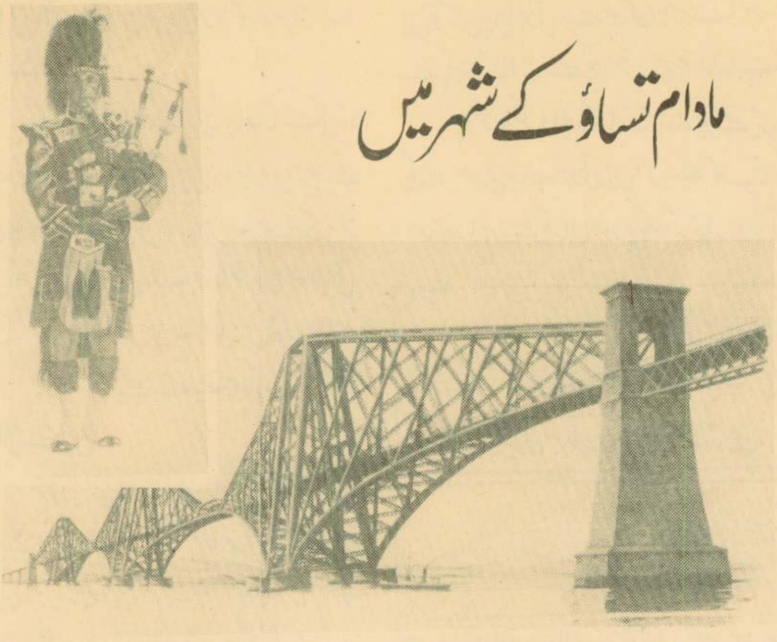

اوّل انعام یافتہ سفرنامہ

تقریباً گیارہ گھنٹے کی طویل پرواز کے بعد ہمارا جہاز لندن کے ہیتھرو ایئرپورٹ پر اُتر گیا. کسٹم وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد جب ہم ایئرپورٹ سے باہر نکلے تو کافی تھک چکے تھے. یہاں سے شہر اور پھر ہمارے مطلوبہ ہوٹل کا راستہ تقریباً آدھا گھنٹے کا تھا. ہم نے سوچا کہ تمام راستہ بس میں سوتے ہوئے جائیں گے مگر بس میں بیٹھنے کے بعد ایک منٹ کے لئے بھی آنکھیں بند نہ کر سکے. بس کے جھٹکوں کی وجہ سے نہیں بلکہ ارد گرد کے خوبصورت مناظر کی وجہ سے. ہر طرف خوبصورت رنگ برنگے پھول کھلے تھے اور جہاں تک نظر جاتی تھی سبزہ ہی سبزہ نظر آتا تھا. لندن کے مضافات میں چھوٹے چھوٹے صاف ستھرے کاٹج بنے ہوئے تھے اور ہر گھر کے ساتھ ہرا بھرا باغ تھا. سارا سفر ان ہی نظاروں سے لطف اندوز ہونے میں گزر گیا. ہوٹل تک پہنچتے پہنچتے رات ہو چکی تھی.

اگلی صبح سویرے تیار ہو کر ہم "ٹریفل گراسکوائر" جانے والی بس میں بیٹھ گئے۔ "ٹریفل گراسکوائر" لندن کے مشہور ترین مقامات میں سے ایک ہے۔ اس جگہ کی نمایاں پہچان یہ ہے کہ یہاں بڑے سے حوض میں خوبصورت فوّارے نصب ہیں۔ ان کے اردگرد بڑے بڑے شیروں کے مجسمے بھی ہیں۔ اور اس کے علاوہ کبوتروں کے جھنڈ کے جھنڈ گردو پیش میں پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ شاید اسی وجہ سے دنیا جہاں کے سیاح یہاں جمع رہتے ہیں۔ جب ہم وہاں پہنچے تو اُس وقت بھی وہاں کافی لوگ موجود تھے۔ ایک طرف اسٹال پر کبوتروں کے لئے دانے کے چھوٹے چھوٹے کپ سے بک رہے تھے۔ میں نے بھی دس پینس کے عوض ایک کپ خرید لیا اور ابھی جاکر حوض کے پاس کھڑا ہی ہوا تھا کہ بہت سے کبوتر آکر میرے بازو اور کاندھے پر بیٹھ گئے اور کپ میں سے دانے چگنے لگے۔ کیسے عجیب کبوتر تھے کہ ڈرتے ہی نہیں ... اطمینان سے قریب آکر بیٹھ جاتے ہیں۔ میں سوچنے لگا کہ انگریز کتنی چالاکی کے ساتھ اپنا دانہ بھی بکوالیتا ہے اور دانہ بھی اُن کے اپنے ہی کبوتر کھا جاتے ہیں۔ مگر اب تو میں خود بھی دانے خرید چکا تھا۔ اور چونکہ خود نہیں کھا سکتا تھا۔ اس لئے کبوتروں کے لئے چھوڑ کر وہاں سے نکل آیا۔ دریائے ٹیمز یہاں سے زیادہ دُور نہ تھا۔ میں ٹہلتے ٹہلتے اس طرف نکل آیا۔ یہ دریا کا پُرسکون کنارہ تھا۔ اور دریا کے کنارے ریشمی گھاس پر کرسیاں رکھی تھیں۔ مجھے آتے دیکھ کر ایک لڑکی تیزی سے میری جانب لپکی۔ میں دُور سے دیکھ چکا تھا کہ اسی لڑکی نے ایک سردارجی کو نہایت عزت سے کرسی پیش کرنے کی کوشش کی۔ مگر سردارجی انکار کرتے ہوئے گھاس پر بیٹھ گئے۔ اور جب میں قریب پہنچا تو لڑکی نے مجھے بھی نہایت تہذیب سے کرسی پر بیٹھ کر واٹرلو پُل کا نظارہ کرنے کی دعوت دی۔ مجھے یہ شاندار پیش کش لگی۔ اس لئے آرام سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ ابھی میں بیٹھا ہی تھا کہ لڑکی نے کرسی پر سے نمبر اُتارا اور مجھ سے پچیس پنس طلب کئے۔ تب ہمیں سفید فام لڑکی کی

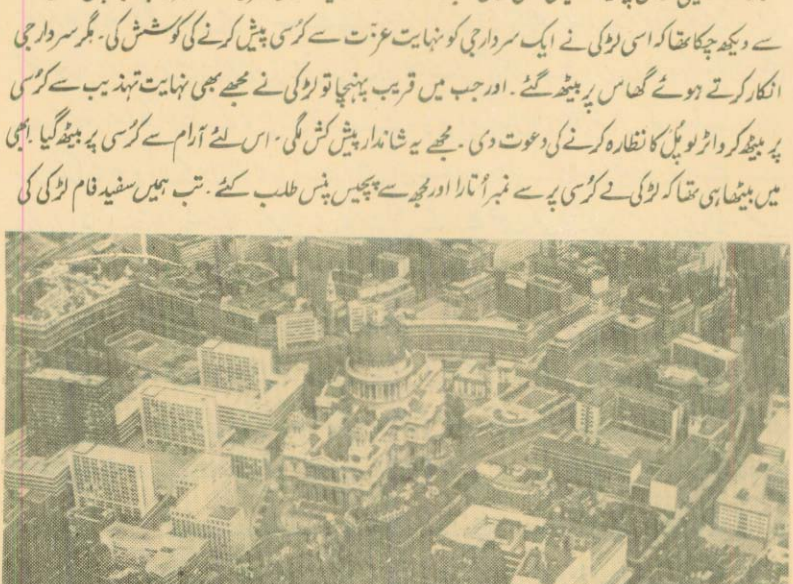

اس خوش اخلاقی کی اصل وجہ کیا تھی ؟ کرسی مجھے اتنی مہنگی لگی کہ چُبھنے لگی۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ پچیس بینس لڑکی کے حوالے کئے اور مُڑ کر سردار جی کی طرف دیکھا جو مجھے دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرا رہے تھے۔ جیسے کہہ رہے ہوں "ہم سکھ بے وقوف ہوتے ہیں یا ہمیں بے وقوف کہنے والے بیوقوف ہوتے ہیں"۔

لندن میوزیم کا شہرہ ہم نے پاکستان ہی میں سُن رکھا تھا۔ اس لئے ادھر جانے کا ارادہ کیا اور قریبی اسٹاپ سے ایک بس میں بیٹھ گئے۔ اور لندن کے مشہور علاقوں اور سڑکوں سے گزرنے لگے۔ پکاڈلی سرکس، ریجنٹ اسٹریٹ اور پھر آکسفورڈ اسٹریٹ سے گزرتے ہوئے ہم بیکر اسٹریٹ Baker street پر آ گئے کہ جاسوسی دنیا کے بادشاہ "شرلاک ہومز" کی رہائش گاہ کے لئے مشہور ہے اور کہانیوں کے مطابق اس کے مکان نمبر ۲۲۱ میں اس کی رہائش تھی۔ اسٹریٹ کے موڑ پر جہاں "بیکر اسٹریٹ" کا بورڈ لگا ہے وہاں شرلاک ہومز کی تصویر بھی اس بورڈ پر بنائی گئی ہے۔ بیکر اسٹریٹ سے مڑ کر ہم میریلیبون روڈ پر آ گئے۔ جہاں مشہور زمانہ "مادام تساؤ" کا مومی عجائب خانہ اور "لندن پلینیٹیریم" ہے اور پھر مختلف علاقوں سے ہوتے ہوئے اپنی منزل پر پہنچ گئے۔ میوزیم تو لندن میں بہت ہیں مگر قابلِ ذکر برٹش میوزیم، نیچرل ہسٹری میوزیم، سائنس میوزیم، نیشنل جغرافک میوزیم اور بائیولوجیکل میوزیم ہیں۔ سب سے پہلے ہم 'برٹش میوزیم' پہنچے۔ یہاں پر موجود تبرکات میں نبئ آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ریش مبارک اور حضرت علیؓ کی تلوار ہے۔ اس کے علاوہ کوہِ نور ہیرا بھی ہے۔ کوہِ نور ہیرا ملکہ الزبتھ کے تاج میں نصب ہے۔ یہ ہیرا پورا سال اسی میوزیم میں رکھا جاتا ہے اور ہر سال ملکہ کی تاج پوشی کے دن نکالا جاتا ہے (اس ہیرے پر برطانیہ نے ناجائز قبضہ کر رکھا ہے۔ اسے واپس کر دینا چاہیئے۔) ویسے یہ تمام اہم چیزیں عام نمائش کے لئے نہیں رکھی جاتیں بلکہ میوزیم میں ایک محفوظ مقام پر رکھی گئی ہیں۔ جہاں کسی کو جانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ کبھی کبھی یہ حصّہ بھی کھولا جاتا ہے مگر نہایت سخت انتظامات کے ساتھ اہم شخصیات کو اس حصّے میں جانے کے لئے خصوصی اجازت مل جاتی ہے۔ ویسے کوشش تو میں نے بھی بہت کی اُن کو سمجھانے کی کہ بھئی میں خاص آدمی ہوں مگر اُنہیں یقین نہیں آیا۔ خیر صاحب ہم لوگ لائبریری کی طرف آ گئے جہاں نہایت قیمتی اور نایاب قسم کی کتابیں موجود تھیں۔ عظیم مصنفوں اور شاعروں کے کلام کے قلمی نسخے تھے۔ ان میں شیکسپیئر، ولیم ورڈز ورتھ اور آسکر وائلڈ جیسے لافانی فنکار شامل تھے۔ پرانے زمانے کے بادشاہوں کے ہتھیار اور دوسری استعمال کی چیزیں مثلاً اُن کے تاج اور شاہی لباس بھی تھے۔ جن میں کئی لباس تو ایسے تھے کہ پورے لباس پر ہیرے جواہرات جڑے تھے۔ ان پر نظر پڑتے ہی کہانیوں میں پڑھا ہوا وہ پورا دور جیتا جاگتا محسوس ہونے لگا۔ جب صحیح

معنوں میں بادشاہت قائم تھی اور شہزادے شہزادیوں کے قصے عام تھے۔ مگر دیو اور جادوگر تو پھر بھی نہیں تھے۔
بائیولوجیکل میوزیم کے ہال میں موجود زینہ چڑھ کر جب اوپر پہنچے تو سامنے ایک بڑا سا مجسمہ نظر آتا ہے۔
یہ مجسمہ اس میوزیم کے پہلے ڈائریکٹر سر رچرڈ ایوین Sir Richard Ewen کا ہے جنہوں نے
اٹھارہویں صدی میں اس کی بنیاد رکھی۔ یہیں پر ایک درخت کے بہت بڑے تنے کا ٹکڑا رکھا نظر آتا
ہے۔ یہ دنیا کا سب سے چوڑا تنا مانا جاتا ہے۔ اس کی چوڑائی ۱۴ رفٹ اور درخت کی لمبائی ۱۱۲ رمیٹر ہے۔
اس درخت کا نام Caart Redwood ہے، اور یہ کیلیفورنیا میں پایا جاتا ہے۔ اس میوزیم میں پتھر کے
زمانۂ قدیم کی یادگاریں محفوظ تھیں۔ جب انسان جنگلوں میں رہتا تھا۔ پتھر کے ہتھیار استعمال کرتا تھا۔
اور تہذیب کی ہوا اُسے چھُو کر بھی نہیں گزری تھی۔ لیکن پھر انسان جیسے جیسے ترقی کرتا گیا اور مہذب
ہوتا چلا گیا۔ اس ارتقائی عمل کو مجسموں اور اس زمانے میں استعمال ہونے والی چیزوں کے ذریعے دکھایا
گیا تھا۔ گویا اس طرح سے ڈارون کی تھیوری کو بھی (جس کے مطابق انسان پہلے بندر تھا) مختلف مرحلوں
کے ذریعے دکھایا گیا تھا۔ لوگ اسے بڑی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ مگر سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے تو
انسانیت کے ساتھ ڈارون کا یہ سنجیدہ مذاق اور اس کی نمائش ایک آنکھ نہیں بھائی۔ اسی طرح نیچرل ہسٹری
میوزیم میں مختلف ادوار اور اقسام کے جانور دکھائے گئے تھے۔ زمانہ قبل از تاریخ کے جانور جنہیں
Dinasorous کہا جاتا ہے ان کے ڈھانچے بھی تھے۔ جنہیں نہایت مہارت کے ساتھ چٹانوں میں
سے کھود کر یہاں لاکر رکھا گیا ہے۔ سائنسدانوں نے ان ڈھانچوں کی ساخت کے مطابق ان کے مجسمے
بھی تیار کر لیے ہیں جو ڈھانچوں کے ساتھ ہی رکھے گئے ہیں۔ سائنس میوزیم میں گاڑیاں، انجن، ہوائی جہاز
اور بحری جہازوں کے ماڈل ہیں جن میں سب سے پہلے بننے والی گاڑی انجن اور جہاز سے لے کر اب
تک کے ماڈل دکھائے گئے ہیں۔ غرضیکہ ہمارا پورا دن ان عجائب گھروں کی سیر میں گزر گیا۔ یہاں تک کہ
رات ہوگئی۔

دوسرے دن ہم نے مادام تساؤ کا مومی عجائب خانہ دیکھنے کا پروگرام بنایا۔ ہم قریبی ٹیوب اسٹیشن پہنچ
گئے اور میریلیبون اسٹیشن کی طرف جانے والی ٹیوب (زیرِ زمین چلنے والی گاڑی) پر بیٹھ گئے۔ اس ٹیوب کی یہ
خصوصیت ہے کہ زیرِ زمین جاکر بھی آپ کو ہر قسم کی سہولت حاصل رہی ہے۔ پلیٹ فارموں پر نصب مشینوں
سے پیسے ڈالنے سے آپ کو چاکلیٹ، چیونگم، سگریٹ، کولڈ ڈرنک اور چائے وغیرہ مل جاتی ہے، فون کی
سہولت بھی ہے۔ ٹائلٹ موجود ہیں اور چھوٹی چھوٹی دکانوں پر سے ضرورت کی چیزیں مل جاتی ہیں۔ بڑے

اسٹیشنوں پر تو باقاعدہ سپر اسٹورز ہیں۔ نیچے جانے کے لئے لفٹ کی سہولت ہے اور ٹیلی وژن بھی نصب ہیں۔
وکٹوریہ اسٹیشن لندن کا سینٹرل اسٹیشن ہے جہاں سے لندن کے کسی بھی کونے میں جانے کے لئے بس اور ٹیوب ملتی ہیں۔ اسٹیشن کے اندر ہی سپر مارکیٹ ہے۔ جہاں ہر چیز دستیاب ہے۔ یہاں پر نصب فون بوتھ کے ذریعے دنیا کے کسی کونے میں بھی فون کیا جاسکتا ہے۔ خیر تو جناب ہم جارہے تھے مادام تساؤ کی طرف۔ مادام تساؤ کے ساتھ ہی لندن پلینیٹیریم بھی ہے۔ ہم نے دونوں کا ٹکٹ ساتھ ہی لے لیا اور پہلے پلینیٹیریم میں آگئے۔ یہ ایک بہت بڑے گول گنبد کی طرح ہے جس کے بیچ میں آرام دہ کرسیاں موجود ہیں میں بھی اپنے نمبر کے حساب سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ جب ہال لوگوں سے بھر گیا تو اچانک روشنی گل ہوگئی جب کچھ دیر تک اندھیرا رہا تو مجھے ڈر ہوا کہ کہیں اندھیرے میں ہمیں سیاح جان کر کوئی لوٹ نہ لے۔ میں نے جلدی سے اپنی جیبیں ٹٹولیں۔ سب کچھ ٹھیک تھا۔ اسی لمحے میری آنکھوں پر تیز روشنی پڑی اور مجھے یوں لگا جیسے میں گھوم رہا ہوں، گھوم نہیں رہا تھا بلکہ وہ مناظر چل رہے تھے جو گنبد کی گول چھت پر نظر آرہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی سیارے پر پہنچ گئے ہوں اور چاروں طرف مختلف سیارے سورج اور چاند ستارے اردگرد گھوم رہے ہوں۔ ساتھ ہی ایک آواز آسمان اور ان تمام خلائی چیزوں کے بارے میں بتانے لگی۔ بالکل ایک خلائی ماحول سا پیدا ہوگیا تھا۔ اور پتا ہی نہیں چلا کہ کب یہ آدھے گھنٹے کا پروگرام شروع ہوکر ختم ہوگیا۔
یہاں سے نکل کر اب ہم نے "مادام تساؤ" کا رخ کیا۔ یہ "مومی عجائب خانے" کے نام سے بھی مشہور ہے۔ دراصل اس میں بڑے بڑے لوگوں کے مومی مجسمے بنا کر رکھے گئے ہیں۔ یہ عجائب خانہ اٹھارہویں صدی میں مادام تساؤ Madame Tussaud نے بنایا تھا۔ انھیں بچپن ہی سے مومی مجسمے بنانے کا شوق تھا اور جب انھوں نے یہ کام شروع کیا تو وہ اکیلی تھیں۔ پھر انھوں نے اپنے بھانجے بھتیجے وغیرہ کو بھی سکھایا اور آہستہ آہستہ ترقی کرتے یہ ایک بہت بڑا اور مشہور عجائب خانے کی شکل اختیار کر گیا۔ اور اب یہ باقاعدہ ایک ادارہ بن چکا ہے جس کے تحت یہ کام سکھایا بھی جاتا ہے۔ ہم گیٹ پر پہنچے تو ایک آدمی ہاتھ آگے کئے کھڑا تھا۔ میں سمجھا ٹکٹ چیکر ہے میں نے ٹکٹ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا مگر جب وہ ویسے کا ویسا کھڑا رہا تو تب پتا چلا کہ وہ مجسمہ ہے جی ہاں وہ مجسمے واقعی اتنی خوبصورتی سے بنائے گئے ہیں کہ ایک جیتے جاگتے انسان اور ان میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔ خیر جناب سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچے وہاں پر بھی ہر دروازے پر ایک مجسمہ کھڑا نظر آیا۔ "اس دفعہ میں بے وقوف نہیں بنوں گا" میں نے دل میں سوچا اور نہایت اطمینان سے چلتے ہوئے اس کے پاس سے گزر گیا۔ مگر جیسے ہی اس سے آگے نکلا اس نے

پیچھے سے مجھے پکڑ لیا۔ اور بولا "ٹکٹ پلیز" وہ واقعی ٹکٹ چیکر تھا۔ یہ کوئی ایک ہال یا کمرہ نہیں بلکہ بہت سے بڑے بڑے ہال، کمرے، کور گیلریوں پر مشتمل عجائب خانہ ہے جہاں ہر جگہ آپ کو کوئی نہ کوئی مشہور شخصیت کسی کونے میں کھڑی، گیلری کی ریلنگ پر بیٹھی۔ گفتگو کے انداز میں آمنے سامنے کھڑی، کہیں آرام کرتی ہوئی نظر آئے گی۔ ایک طرف جائیں تو شیکسپیئر کسی سوچ میں ڈوبا ہوا نظر آئے گا۔ دوسری طرف نپولین بوناپارٹ فوجی وردی میں نہایت مستعد کھڑا نظر آئے گا۔ گاندھی جی اُسی طرح دھوتی پہنے اپنا مخصوص ڈنڈا پکڑے کھڑے ہیں تو ایک جانب مارگریٹ تھیچر ہاتھ میں پرس لٹکائے ہوئے ہیں۔ اسی طرح مائیکل جیکسن محمد علی باکسر، صدر ریگن، گاندھی کرسٹی، الزبتھ ٹیلر اور اتنے لوگ ہیں کہ ہم نام تک بھول گئے ہیں۔ ایک ہال میں داخل ہوئے تو اچانک فائر کی آواز آئی اور ساتھ ہی گولے پھٹنے کا دھماکہ سنائی دیا۔ سامنے نظر پڑی تو ایک آدمی بندوق کا رُخ میری طرف کئے کھڑا ہے۔ میں بھاگنے کو ہی تھا کہ نظر اُس کے آس پاس کھڑے دوسرے فوجیوں پر پڑی تو سمجھ آیا کہ یہاں دوسری جنگِ عظیم کا ایک منظر دکھایا گیا ہے۔ راستے کے دونوں طرف فوجی ہتھیار لئے کھڑے ہیں۔ کوئی توپ چلا رہا ہے۔ کسی کے ہاتھ میں بم ہے۔ جگہ جگہ زخمی اور مردے پڑے ہیں۔ خون اور انسانی اعضاء بکھرے پڑے ہیں۔ پھر گولیاں چلنے کی آوازیں، چیخ و پکار جو کہ چاروں طرف سے کیسٹ کے ذریعے سنائی دیتی تھیں۔ ان سے واقعی یوں لگتا ہے جیسے آپ سچ مچ میدانِ جنگ میں آگئے ہوں۔ ایک سجے سجائے شاندار کمرے میں داخل ہوں تو ایک خوبصورت مسہری پر ایک شہزادی لیٹی نظر آتی ہے۔ اس کے ارد گرد بے شمار کنیزیں کھڑی ہیں اور ایک طبیب شہزادی کا ہاتھ پکڑے اس کی نبض دیکھ رہا ہے۔ شہزادی بیماری کی حالت میں نہایت آہستہ آہستہ سانس لے رہی ہے۔ قریب جائیں تو دل دھڑکنے کی آواز بھی سنائی دیتی ہے۔ یہ کمال بھی مجسمہ سازی ہی کا ہے۔ ایک اور کمرے میں داخل ہوں تو چاروں طرف لان ٹینس کے ریکٹس اور بال، جوتے اور کپڑے بکھرے نظر آئیں گے اور وسط میں ایک کرسی پر لان ٹینس کے مشہور کھلاڑی "بیون بورگ" بیٹھے ہیں۔ ایک بڑے ہال میں ایک طرف اسٹیج پر انگلینڈ کے شاہی خاندان کے افراد کھڑے نظر آتے ہیں۔ اور ان کے چاروں طرف ایک گولڈن زنجیر بندھی ہوئی ہے۔ گویا شاہی خاندان کے افراد کے مجسموں کے بھی قریب نہیں جایا جا سکتا۔ اس طرح کے اور بہت سے مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں جن کو دیکھنے کے بعد اب ہم نے تہہ خانے کا رُخ کیا۔ جسے "چیمبر آف ہارر" Chamber Horrors کہا جاتا ہے۔ یہاں کے کئی مناظر واقعی ہی بہت ڈرا دینے والے ہیں۔ دھیمی دھیمی روشنی، پیچھے سے سنائی دینے والی آوازوں اور چیخوں کا تاثر ماحول کو بہت پُر اسرار بنا دیتا ہے۔

ایک طرف ایک خوفناک ساجلّاد جس نے ہاتھ میں ملکہ میری کی کٹی ہوئی گردن پکڑ رکھی ہے۔ گردن میں سے خون ٹپکتا ہوا نظر آتا ہے۔ ملکہ میری کو اُس کی کزن الزبتھ نے خود ملکہ بننے کے لئے مروا دیا تھا۔ ذرا آگے ایک عورت ریل کی پٹڑی پر لیٹی نظر آتی ہے جسے ایک عورت اور بچے کے قتل میں موت کی سزا سنائی جاتی ہے پھر اندھیرا چھا جاتا ہے۔ ریل کے آنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ ایک چیخ بلند ہوتی ہے اور پھر روشنی ہوتی ہے۔ تو اُس عورت کا کٹا ہوا جسم نظر آتا ہے۔ ایک اور مجرم الیکٹرک چیئر پر بیٹھا ہے۔ کرسی میں کرنٹ چھوڑی جاتی ہے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اُس کا سارا جسم نیلا پڑ جاتا ہے اس طرح کے اور بہت سے مناظر ہیں جو آپ کو کچھ دیر کے لیے دم بخود ہونے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ پُراسرار چیزیں پسند کرنے والوں کے لئے یہاں واقعی دلچسپی کا بہت سا سامان موجود ہے۔

جمعہ کے دن ہم نے نماز جمعہ "سینٹرل ماسک لندن" میں پڑھنے کا پروگرام بنایا۔ جس وقت ہوٹل سے نکلے ابھی نماز میں کافی وقت تھا۔ چنانچہ ہم راستہ میں بکنگھم پیلس "کے سامنے اُتر گئے۔ بکنگھم پیلس میں شاہی خاندان کے افراد رہتے ہیں۔ اس کے سامنے چوک میں ایک بہت بڑا ستون نظر آتا ہے۔ جس میں چاروں طرف سے پتھر کو تراش کر بچوں اور عورتوں کے مجسمے بنائے گئے ہیں۔ اور ستون کے سب سے اوپر سونے سے ایک نہایت ہی خوبصورت بچّے کا مجسمہ بنایا گیا ہے جس کے پَر بھی دکھائے گئے ہیں۔ اسے "گولڈن اینجل" Golden Angel کہا جاتا ہے۔ بکنگھم پیلس کے بڑے بڑے دروازوں پر سنہری رنگ سے بہت خوبصورت نقش و نگار بنائے گئے ہیں۔ یہ گیٹ "سنہری گیٹ" بھی کہلاتا ہے۔ یہاں کے سپاہی بہت مشہور ہیں۔ بڑا سا کوٹ، سیاہ پتلون پہنے، ایک طرف تلوار لٹکائے، دوسرے ہاتھ میں بڑا سا ڈنڈا پکڑے اور بڑی سی سیاہ رنگ کے فر ٹوپی پہنے جو تقریباً آدھے منہ کو چھپا لیتی ہے۔ یہ سپاہی بالکل گڈّے سے لگتے ہیں۔ اُن کو دیکھ کر میرا بھی بہت دل چاہا کہ ہاتھ لگا کر دیکھوں مگر ہاتھ میں پکڑے ہوئے لمبے ڈنڈے کو دیکھ کر ہمت نہ پڑی اور انہیں چھُونے کی مسرت دل میں ہی لئے سینٹرل ماسک آگئے۔ لندن میں اتنی خوبصورت بڑی اور شاندار مسجد دیکھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔ مسجد میں داخل ہونے کے بعد برآمدے سے آگے ایک بہت بڑا ہال ہے۔ جہاں نماز پڑھی جاتی ہے۔ یہاں عورتوں کے لئے بھی علیحدہ انتظام ہے۔ اور یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی مردوں کے ساتھ عورتوں کی بھی کافی تعداد نماز کے لئے موجود تھی۔ مسجد میں ایک بہت بڑی لائبریری بھی ہے۔ جس میں اسلامی کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ نماز پڑھنے اور پوری مسجد دیکھنے کے بعد ہم نے یہاں سے نکل کر لندن کے چڑیا گھر کا رُخ کیا۔ یہ ایک بہت ہی طویل و عریض

پارک کی شکل میں ہے ۔ جسے ہائیڈ پارک کہا جاتا ہے ۔ اس کا رقبہ اتنا بڑا ہے کہ گھومنے کے لئے پورا دن بھی کم پڑ جائے ۔ مختلف چھوٹے بڑے رنگ برنگے پرندے اور تقریباً ہر قسم کے جانور یہاں موجود ہیں ۔ کچھ جانور جیسے ہرن ، بارہ سنگھے ، ہاتھی ، چیتے وغیرہ کے لئے اتنے بڑے احاطے بنائے گئے ہیں کہ ایک عام چڑیا گھر پورا اس میں آجائے ۔ باقی جانور تو ویسے ہی ہیں جو ہم دوسری جگہ دیکھتے ہیں مگر یہاں کا "سانپ گھر" قابلِ ذکر ہے ۔ یہاں اتنی قسم کے سانپ موجود ہیں کہ آپ کو اور کہیں نظر نہیں آئیں گے ۔۔۔ دیواروں میں نصب بڑے بڑے بکسوں میں شیشے کی دیواروں سے یہ سانپ بالکل قریب نظر آتے ہیں اور صاحب یہ عظیم الجثہ سانپ تیزی سے شیشے کی طرف آتے ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے آپ پر حملے کے لئے لپک رہے ہوں ۔ ایک لمحے کو آدمی ڈر جاتا ہے ۔ کولڈ ڈرنک اور دوسری کھانے کی چیزیں جب یہاں ہر بازار کے مقابلے میں دُگنی قیمتوں پر ملیں تو ہمیں پتا چلا کہ صرف پاکستان کے تفریحی مقامات پر ہی مہنگی چیزیں نہیں ملتیں بلکہ تہذیب یافتہ اور ترقی یافتہ ملکوں کا بھی یہی حال ہے ۔

لندن میں اپنے آخری دن ہم نے بوٹ کے ذریعے دریائے ٹیمز کی سیر کا پروگرام بنایا ۔ اور مقررہ وقت پر Charing Cross pier پر پہنچ گئے ۔ جہاں سے بوٹ کو چلنا تھا ۔ بوٹ میں تیس کے قریب لوگوں کی گنجائش تھی ۔ بوٹ میں ایک کیبن بھی تھا ۔ جس میں ایک چھوٹا سا بار بنا ہوا تھا ۔ جہاں کولڈ ڈرنک اور سینڈ وچیز وغیرہ دستیاب تھے ۔ کیبن میں بھی بیٹھنے کی جگہ موجود تھی مگر دریا کی سیر کرتے ہوئے تو کوئی بھی کیبن میں بند ہو کر بیٹھنا پسند نہیں کرتا ۔ چنانچہ تمام لوگ باہر ہی بیٹھے ہوئے تھے ۔ بوٹ میں موجود گائیڈ دریا کے کنارے پر موجود مختلف جگہوں کے بارے میں بتانے لگا ۔ دریا کی سیر کے دوران بہت سی مشہور جگہیں دیکھنے کو ملتی ہیں ۔ جن میں لندن ٹاور ہے جو ایک زمانے میں بادشاہوں کی رہائش گاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا ۔ پھر یہ قید خانے کے طور پر بھی استعمال ہوا ۔ یہاں مجرموں کو پھانسی بھی دی گئی ۔ "بگ بین" بھی نظر آتا ہے ۔ جو کہ دنیا کا سب سے بڑا گھڑیال مانا جاتا ہے ۔ دریائے ٹیمز کبھی دنیا کا سب سے صاف اور خوبصورت دریا مانا جاتا تھا ۔ مگر اب لوگوں نے اس میں چیزیں پھینک پھینک کر اسے بھی گندا کر دیا ہے ۔

بوٹ کی سیر ختم ہوئی تو دوپہر کا وقت ہو چکا تھا ۔ ہم نے ایک قریبی پاکستانی ہوٹل سے کھانا کھایا ۔ لندن میں دوسرے یورپین ممالک کے مقابلے میں یہ خصوصیت ہے کہ یہاں حلال کھانا آسانی سے مل جاتا ہے ۔ یہاں پر پاکستانیوں ، بنگلہ دیشیوں اور ہندوستانیوں کے بہت سے ہوٹل ہیں ۔ اور

"حلال میٹ شاپس" بھی ہیں۔ جہاں سے ذبح کئے ہوئے جانوروں کا گوشت مل جاتا ہے۔ شام ہونے تک ہمارے پاس کچھ گھنٹے تھے شاپنگ کے لئے۔ کیونکہ دوسرے دن ہماری فلائٹ تھی اور رات کو سامان بھی باندھنا تھا۔ اس دن اتوار تھا۔ جس سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ شہر میں کئی جگہ ہمارے یہاں کے جمعہ بازار منگل بازار کی طرز پر "سنڈے مارکیٹس" لگی ہوئی تھیں۔ جہاں بہت سی چیزیں دستیاب تھیں ——

Selfridges لندن کا سب سے بڑا شاپنگ سینٹر ہے اور اس کے رقبے کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ کئی منزلہ یہ عمارت چار سڑکوں کے بیچ میں واقع ہے۔ جدید طرز پر بنے ہوئے اس خوبصورت سینٹر میں ہر قسم کا سامان ملتا ہے۔ جس میں کھانے کا سامان، کپڑے، جوتے، زیور، کھلونے، ڈیکوریشن پیس وغیرہ سے لے کر فریج، ٹی وی، فرنیچر اور دوسری مصنوعات حتیٰ کہ کچن اور باتھ روم کے تیار ماڈل تک یہاں موجود ہیں۔ شاپنگ سے فارغ ہونے کے بعد ہم آخری بار لندن شہر کی رونقیں دیکھتے ہوئے واپس ہوٹل آ گئے جہاں اب ہمیں صبح کو روانگی کے لئے تیاری کرنی تھی۔

لندن شہر میں سب سے زیادہ خوشی مجھے اُس وقت ہوئی جب میں نے وہاں کے ایک فائیو اسٹار ہوٹل کی شاپ میں جہاں بلاشبہ بہترین سامان رکھا جاتا ہے کچھ شرٹیں اُٹھائیں تو اُن پر "میڈ ان پاکستان" لکھا تھا۔ تب مجھے اپنے ملک کی مصنوعات کی اہمیت کا اندازہ ہوا اور میں آپ سے بھی یہی کہنا چاہوں گا۔ کہ ہمیں فخر کرنا چاہیئے اپنے پاکستان پر، اس کے باشندوں پر اور اس کی ہر چیز پر کہ ہم مسلمان قوم ہیں دنیا کی بہترین قوم۔

کوڑے دان کی دردمندانہ اپیل

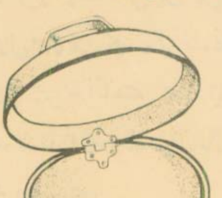

سب کو اپنا حق عزیز ہوتا ہے۔
کوڑا کرکٹ میرا حق ہے
میرے حق کو گلی میں مت پھینکیے۔
مجھے میرا حق دیجیے۔
ورنہ!
مکھیوں، مچھروں اور صفائی پسند
پڑوسیوں سے روزانہ جنگ کے لیے تیار ہو جائیے۔

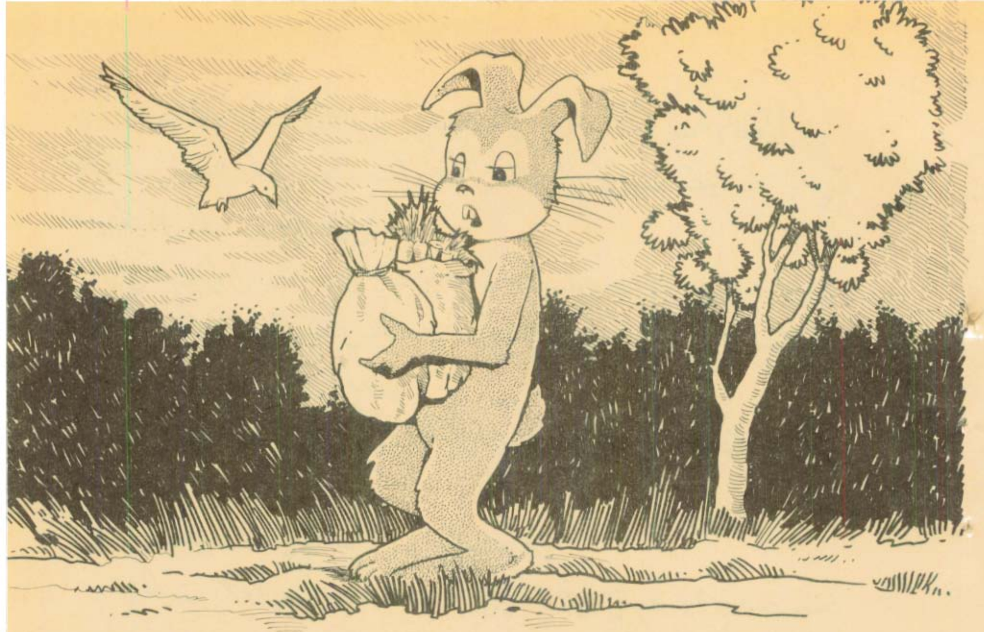

چھوٹا راستہ

شاہنواز فاروقی

کسی زمانے میں گولڈ کوسٹ ملک کے پہاڑی سلسلہ گونگ کی وادی میں گنی نام کا ایک تیتر رہا کرتا تھا۔ گنی کے پاس ایک بڑا سا کھیت تھا جس میں وہ کیلے، اروی، باجرہ اور کئی دوسری اجناس کاشت کیا کرتا تھا۔ گنی بہت محنتی تھا۔ اس لئے اس کا کھیت ہمیشہ سرسبز رہتا تھا۔ اور فصلیں اچھی ہوتی تھیں۔

گنی کے کھیت سے تھوڑے فاصلے پر ایک خرگوش کا کھیت تھا۔ خرگوش بڑا کام چور تھا۔ وہ اپنے کھیت اور فصلوں کی بے دلی سے معمولی دیکھ بھال کرتا تھا۔ اسی لئے اُس کی فصلیں کمزور اور اُن کی پیداوار انتہائی کم ہوتی تھی۔

ایک روز خرگوش ٹہلتا ہوا گنی کے کھیت کی طرف آنکلا۔ خرگوش نے گنی کے لہلہاتے کھیت کو دیکھا تو اُسے بڑا غصہ آیا۔ اور ساتھ ساتھ یہ خیال بھی کہ کاش یہ کھیت اُس کا ہوتا۔ اس نے کھیت پر ایک بھرپور نظر ڈالی اور بولا۔

"گنی کے کھیت پر ہمیشہ بروقت بارش ہوجاتی ہے۔ جبکہ میرا کھیت ہمیشہ ضرورت کے وقت بارش سے

محروم رہتا ہے۔ شاید اسی لئے گنی کا کھیت سر سبز ہے اور میرا سوکھا ہوا" خرگوش نے گویا خود کو تسلی دی۔
"یہ تو ناانصافی ہے" خرگوش نے خود سے کہا۔ خرگوش سارا دن گنی کے کھیت کے بارے میں سوچتا رہا۔ اچانک اُس کے ذہن میں ایک خیال آیا۔

اُسی رات خرگوش اپنے خاندان سمیت آیا اور رات بھر گنی کے کھیت کو پیروں سے روندتا رہا۔ صبح ہوئی تو خرگوش کے بیوی بچوں نے گنی کے کھیت کے ایک حصّے میں اُگی ہوئی سبزیاں گھرے جلنے کے لئے اُکھاڑ کر تھیلیوں میں بھرنی شروع کر دیں۔

گنی صبح کو اپنے کھیت پر پہنچا تو اُس نے خرگوش کو اپنے بیوی بچوں سمیت کھیت کا ستیاناس کرتے دیکھا۔

"تم میرے کھیت کو کیوں اُجاڑ رہے ہو؟" گنی زور سے چلّایا۔

"تمہارا کھیت!" خرگوش نے حیرت سے کہا "تمہیں یقیناً غلط فہمی ہوئی ہے۔ یہ تو میرا کھیت ہے"

"کمال ہے! میں برسوں سے اس کھیت کا مالک ہوں۔ میں یہاں خود فصل بوتا اور اُس کی دیکھ بھال کرتا ہوں، اور تم کہہ رہے ہو کہ یہ تمہارا کھیت ہے" گنی نے کہا۔

"بکومت! میں یہاں خود فصل اُگاتا ہوں" خرگوش نے جواب دیا۔ گنی نے یہ سُنا تو غصّے سے بھر گیا۔

"اب بس نکلو میرے کھیت سے" گنی نے لال پیلا ہو کر کہا۔

"میں کہتا ہوں تم نکلو" خرگوش نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

دونوں بہت دیر تک کھیت پر اپنی ملکیت کا دعویٰ کرتے رہے۔ بالآخر دونوں نے طے کیا کہ گاؤں کے مُکھیا سے جا کر اس بات کا فیصلہ کراتے ہیں کہ کھیت کس کا ہے۔ چنانچہ دونوں مُکھیا کے پاس جا پہنچے۔

دونوں کے بیانات سننے کے بعد مُکھیا خود معائنہ کرنے کے لئے کھیت پر پہنچا۔

"تمہارے گھر سے کھیت تک آنے والی پگڈنڈی کہاں ہے؟" مُکھیا نے کھیت کا بغور معائنہ کرنے کے بعد خرگوش سے پوچھا۔

"وہ رہی جنابِ عالی!" خرگوش نے کھیت کو اجاڑنے والی رات میں تیار کی گئی پگڈنڈی کی جانب اشارہ کیا۔

"اور تمہارے گھر سے کھیت تک آنے والی پگڈنڈی کہاں ہے؟" مُکھیا نے گنی سے پوچھا۔

"پگڈنڈی؟ میرے گھر سے کھیت تک تو کوئی پگڈنڈی نہیں ہے" گنی نے کہا۔

"بھئی جس کے پاس کھیت ہوتا ہے اُس کے گھر سے کھیت تک آنے جانے کے لئے کوئی نہ کوئی راستہ ضرور ہوتا ہے۔" مکھیا نے بھاری بھرکم آواز میں کہا۔

"مگر جناب میں تو اپنے کھیت پر اُڑ کر آتا ہوں" گنی بولا۔

مکھیا نے گنی کی بات غور سے سنی اور سر ہلایا۔ پھر بولا۔

"جس کے پاس کھیت ہوتا ہے۔ اُس کے گھر سے کھیت تک بہر حال ایک راستہ یا پگڈنڈی ضرور ہوتی ہے۔ چنانچہ میرا فیصلہ یہ ہے کہ کھیت خرگوش کا ہی ہے۔" مکھیا نے یہ کہا اور اپنے گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔

مکھیا کا فیصلہ سنتے ہی خرگوش اور اُس کے خاندان نے گنی کے کھیت کو مزید روندنا شروع کر دیا۔ گنی نے یہ سب دیکھا اور تلملاتا ہوا اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔

خرگوش نے جب گنی کے کھیت سے ارویوں کا ایک بڑا سا تھیلا بھر لیا تو اُس نے سوچا کہ کیوں نہ ارویوں کو بازار میں فروخت کر کے مال کمایا جائے۔

مگر تھیلا اتنا وزنی ہو چکا تھا کہ خرگوش اُسے بڑی مشکل سے اُٹھا پا رہا تھا۔ ویسے بھی خرگوش کو محنت کی عادت تو تھی نہیں۔ بہر حال خرگوش نے بڑی مشکل سے تھیلا اُٹھایا اور بازار کی سمت چل پڑا مگر ابھی تھوڑی ہی دُور گیا تھا کہ تھک کر بیٹھ گیا اور سستانے لگا۔ خرگوش کو سستاتے ابھی چند لمحے ہی گزرے تھے کہ گنی وہاں سے گزرا۔

"لگتا ہے بھائی خرگوش وزن کی زیادتی کے باعث تھک گئے ہیں لائیے میں تھیلے کو اُٹھا کر بازار تک پہنچا دوں" گنی نے خرگوش کو دیکھ کر کہا۔

گنی کا محبّت بھرا رویہ دیکھ کر خرگوش بڑا متاثر ہوا۔

"لگتا ہے گنی اب مجھ سے ناراض نہیں" خرگوش نے من میں سوچا

"شکریہ بھائی گنی ... تم واقعی بہت اچھے ہو" خرگوش نے کام نکالنے کے لئے مکھن لگایا۔ پھر بولا۔

"ہوگی تو خیر آپ کو تکلیف مگر آپ تھیلے کو بازار تک پہنچا دیں گے تو آپ کی بڑی مہربانی ہوگی"

گنی تو تھا ہی اسی انتظار میں۔ اُس نے تھیلا اُٹھا کر سر پر رکھا اور پر پھڑ پھڑا کر اُڑ گیا۔ مگر بازار کی طرف نہیں بلکہ اپنے گھر کی طرف۔

خرگوش نے گنی کو بازار کے بجائے اپنے گھر کی طرف جاتے دیکھا تو اُس کے پیچھے دوڑا مگر اس وقت تک گنی خاصی بلندی پر پہنچ چکا تھا۔ خرگوش طیش میں آگیا اور شکایت لے کر فوراً مکھیا کے پاس پہنچا۔

"گنی نے مجھے لوٹ لیا!" خرگوش نے مکھیا سے جا کر فریاد کی۔ "وہ میرا سبزی سے بھرا تھیلا لے ک

آگے

گیا ہے۔"

مُکھیا نے اپنے کارندے کو بھیج کر فوراً گنی کو بلوالیا۔

"حضورِ والا! وہ میرا تھیلا تھا" گنی نے مُکھیا کے سامنے حاضر ہو کر کہا۔

"یہ جھوٹ بولتا ہے تھیلا میرا تھا اور میں نے ہی اُس میں اپنی کاشت کی ہوئی ارویاں بھری تھیں" خرگوش چلّایا۔

دونوں بہت دیر تک ایک دوسرے پر برستے رہے۔ مُکھیا دونوں کی باتیں غور سے سنتا رہا۔ پھر کچھ دیر بعد بولا۔

"جب کوئی بہت دنوں تک سر پہ بوجھ اُٹھا کر چلتا ہے تو اُس کے سر کے بال گِر گِر کم ہونے لگتے ہیں۔"

"جی ہاں آپ بجا کہتے ہیں" خرگوش نے مُکھیا کی بات کی تائید کی۔

"اچھا تو میاں خرگوش ذرا تم مجھے اپنا سر تو دکھاؤ" مُکھیا نے خرگوش کے پاس آکر کہا۔ خرگوش نے اپنا سر مُکھیا کے سامنے کر دیا۔ مکھیا نے خرگوش کے سر کو غور سے دیکھا اور بولا۔

"تمہارے سر پر تو گھنے اور لمبے بال ہیں" پھر مُکھیا نے گنی کو اپنا سر دکھانے کے لئے کہا۔ گنی نے اپنا سر مُکھیا کے آگے کر دیا۔ گنی کے سر پہ ایک بھی لمبا بال نہیں تھا۔

"یقیناً ارویوں سے بھرا ہوا تھیلا تمہارا ہی تھا" مُکھیا نے گنی کا سر دیکھتے ہی فیصلہ سُنا دیا۔

"مگر گنی کے سر پر تو کبھی بال تھے ہی نہیں۔ یہ تو پیدائشی طور پر گنجا ہے بلکہ یہ کیا اس کی پوری نسل پیدائشی طور پر گنجی ہوتی ہے" خرگوش نے مکھیا کا فیصلہ سُن کر احتجاجی آواز میں کہا۔

"جب کوئی طویل عرصے تک اپنے سر پر وزن اُٹھا کر چلتا ہے تو اُس کے سر کے بال کم ہو جاتے ہیں۔" مُکھیا نے دوٹوک الفاظ میں کہا "چنانچہ میرا فیصلہ ہے کہ ارویوں کا تھیلا گنی ہی کا تھا۔"

مُکھیا کے فیصلے کے بعد گنی خوشی سے جھومتا اپنے گھر روانہ ہو گیا۔ دوسری طرف خرگوش مایوسی کے ... میں دوبارہ کھیت پر پہنچا اور اُس نے پھر بہت سی ارویاں اُکھاڑ کر تھیلے میں بھریں تاکہ اُنہیں بازار میں ...ت کر سکے۔ ابھی اُس نے تھیلا اُٹھا کر سر پہ رکھا ہی تھا کہ گنی اُڑتا ہُوا آیا اور ارویوں سے بھرا ... خرگوش نے غصّے میں بھر کر تیسرا تھیلا بھرا مگر گنی اُسے بھی لے اُڑا۔ ظاہر ہے کہ ... نہیں جا سکتا تھا۔ بالآخر خرگوش نے تنگ آکر گنی کا کھیت چھوڑ دیا اور اپنے ...

...ے کسی دانا نے کہا ہے۔

"...منزل تک نہیں جاتا!"

کوپن کا صفحہ

آنکھ مچولی میں موجود مختلف نوعیت کے کوپن کاٹ لینے کی وجہ سے نہ صرف رسالہ بدنما ہو جاتا تھا بلکہ کوپن کی پُشت پر موجود تحریر بھی ضائع ہو جاتی تھی۔ اب آپ کی سہولت کی خاطر ہم نے تمام کوپن کو ایک صفحے پر یکجا کر دیا ہے۔

مقابلۂ معلومات "جستجو شرط ہے" میں شامل ہونے کا کوپن

نام ---------- کلاس ---------- عمر ----------
پتہ --
حاصل کردہ پوائنٹس ----------

قلمی دوستی "سالگرہ کے ساتھی" میں شرکت کا کوپن

نام ---------- جماعت ----------
تاریخ و سن پیدائش ---------- مشاغل ----------
پسندیدہ مضمون ---------- بڑے ہو کر کیا بننا چاہتے ہیں ----------
پتہ --

آنکھ مچولی کی سالانہ خریداری کا کوپن

نام خریدار ---------- رسالہ کس ماہ سے جاری کیا جائے ----------
پتہ ---------- فون نمبر (اگر ہو) ----------
میں ۱۵۰ روپے منی آرڈر کر رہا ہوں۔ مجھے آنکھ مچولی جاری کر دیا جائے ---- یا ---- میں دس روپے کے ڈاک ٹکٹ بھجوا رہا ہوں۔ مجھے ایک سال کے لئے رسالہ جاری کر دیا جائے۔ میں پہلا رسالہ ۱۴۰ روپے وی پی کے عوض چھڑوا لوں گا۔
دستخط ----------

VOICE OF THE NEGLECTED

ANSAR BURNEY WELFARE TRUST

معاهده

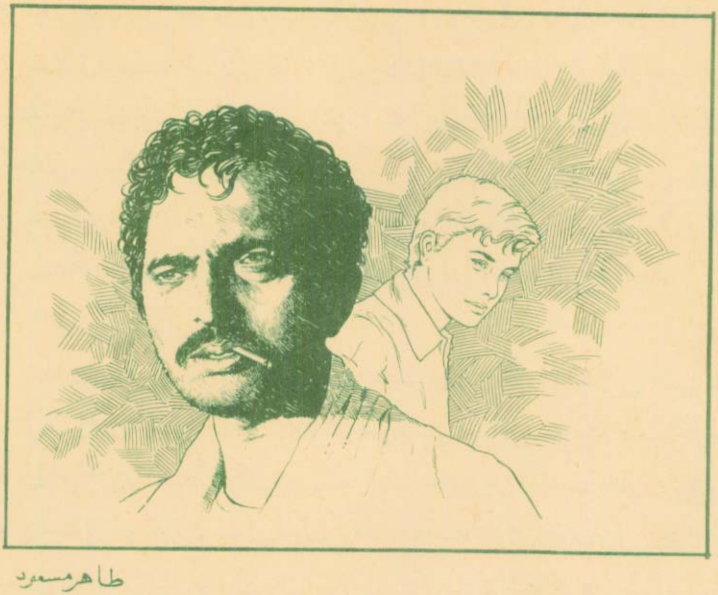

طاہر مسعود

سلطان میں ایک عادت بہت ہی بُری تھی۔ انگوٹھا چوسنے کی عادت۔ صاحبزادے اچھے خاصے بڑے ہوچکے تھے۔ اسکول جاتے تھے لیکن اس طرح کہ انگوٹھا چوُستے ہوئے جاتے تھے اور انگوٹھا چوستے ہوئے واپس آتے تھے۔ کلاس میں بھی سر جُھکا کے اسی نیک کام میں مصروف رہتے تھے۔ کیا گھر کیا اسکول۔ اس عادت پر ہر جگہ ڈانٹ پھٹکار پڑتی۔ کئی بار پِٹے بھی۔ لیکن مجال ہے جو عادت چھوٹی ہو۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ ہر ظلم وستم سہہ سکتے تھے لیکن اس معاملے میں سمجھوتہ کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ یہاں تک کہ کہنے سننے والوں نے کہنا سننا بھی چھوڑ دیا تھا۔ سوائے امی جان کے جواب بھی ہاتھ دھوکے اس کے پیچھے پڑی رہتی ہیں۔ ادھر سلطان میاں کا انگوٹھا منہ میں گیا اور وہ چلاّئیں ...

"سلطان! نکالو منہ سے انگوٹھا"

سلطان کو معلوم تھا کہ یہ بُری عادت ہے۔ لیکن وہ کرتا بھی کیا۔ شروع سے عادت ہی ایسی پڑ گئی تھی۔ ممکن ہے اتنی سختی ابتدا میں کی جاتی تو اُس کی اصلاح ہوجاتی لیکن غالباً اُس

وقت سمجھا گیا کہ بچّہ ہے۔ بڑا ہو کر خود بخود ٹھیک ہو جائے گا۔ اور جب کچھ بڑے ہو کر بھی انگوٹھا سلطان میاں کے منہ سے نہیں نکلا تو پھر سب کو تشویش ہونی شروع ہوئی۔ اور تب جا کر سب کی سمجھ میں آیا کہ ایسی عادتیں بھلا خود سے کہاں چھٹتی ہیں۔ اِدھر انگوٹھے کا حال بُرا ہو رہا تھا۔ مسلسل منہ میں رہنے کی وجہ سے سفید پڑ گیا تھا۔ ناخن تو ایسا لگتا تھا کہ کاٹو تو لہو نہیں۔ کھال لعاب میں بھیگے رہنے کی وجہ سے عجیب سی ہو گئی تھی۔ بہت سوچنے سمجھنے کے بعد ایک دن امّی نے انگوٹھے پر پٹّی باندھ دی۔ جب تک انگوٹھے پر پٹّی بندھی رہی اسے عجیب بے چینی اور بے کلی سی رہی۔ ہاتھ بے خیالی میں بار بار منہ کی طرف جاتا اور پھر مایوسی سے لوٹ آتا۔ یہاں تک کہ اُس نے چُھپ کر پٹّی نوچ پھینکی۔ امّی نے جو انگوٹھے کو پٹّی سے خالی پایا تو چھڑی سے خوب خبر لی۔ وہ پٹتا جاتا تھا اور چیختا جاتا تھا۔

"اب نہیں کروں گا امّی ... اب نہیں کروں گا"

گھر میں جو اُس کے ہمدرد پائے جاتے تھے، دوڑے بھاگے اور اُسے امّی کے غیض و غضب سے بچایا۔ ورنہ امّی کے ہاتھوں نہ جانے اس کا کیا حشر ہوتا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ ابھی اُسے پٹتے ہوئے مشکل سے ڈیڑھ دو گھنٹے بھی نہیں ہوئے تھے کہ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ سلطان میاں مزے سے دالان میں بیٹھے انگوٹھا چوس رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر امّی نے بھی توبہ کر لی کہ آئندہ وہ اُسے نہ روکیں گی نہ ٹوکیں گی۔ لیجئے چھٹّی ہوئی۔ اب کون تھا سلطان میاں کو روکنے والا۔ اب تو وہ نڈر ہو کر جہاں چاہتے اطمینان سے انگوٹھا چوس سکتے تھے۔

ہاں مگر ہم نے تو آپ کو یہ بتایا ہی نہیں کہ سلطان میاں کے پاپا کا رویّہ اس معاملہ میں کیا تھا۔ بات یہ تھی کہ پاپا خود ایک بُری عادت کے شکار تھے۔ سگریٹ نوشی کی عادت۔ شاید ہی کوئی وقت ایسا جاتا ہو جب ان کی انگلیوں میں سگریٹ نہ جلتا ہو۔ ایک تو وہ بہت کم گو تھے۔ بلا ضرورت بولتے ہی نہیں تھے۔ اُنہیں سوچنے کی بھی عادت تھی، لیکن سوچنا تو اچھی بات ہوتی ہے۔ جب وہ گہری سوچ میں ہوتے تو اُن کے سگریٹ پینے کی رفتار بڑھ جاتی تھی۔ ایش ٹرے سگریٹ کے ٹکڑوں سے بھر جاتا تھا۔ کمرہ دُھواں دھواں ہو جاتا تھا۔ بے تحاشہ سگریٹ نوشی کی وجہ سے اُنہیں کھانسی کی شکایت ہو گئی تھی۔ ایک دم بیٹھے بیٹھے کھانسی کا دورہ پڑ جاتا، اور وہ پیک دان میں بلغم تھوکنے لگتے تھے۔ ڈاکٹروں نے اُنہیں سگریٹ پینے سے منع کیا تھا۔ لیکن وہ اس قسم کے مشوروں کو ایک کان سے سُن کر دوسرے کان سے اُڑا دینے کے عادی تھے۔ سلطان کی امّی اُن سے اس بات پر خوب لڑتیں، اُن کی صحت کا حوالہ دیتیں۔ سگریٹ کے نقصان دہ اثرات کے بارے میں بتاتیں لیکن اُس کے جواب میں پاپا ایک لمبی خاموشی اختیار کر لیتے۔ وہ کبھی کبھار کہا بھی کرتے تھے کہ ایک چُپ ہزار بلا کو ٹالتی ہے۔

سلطان امّی اور پاپا کی اس نوک جھونک کو بڑی دلچسپی سے دیکھا کرتا تھا۔ وہ سوچتا تھا: "امّی ہر وقت ہر کسی کو ڈانٹتی ڈپٹتی رہتی ہیں۔ اُسے انگوٹھا چوسنے سے منع کرتی ہیں۔ پاپا کو سگریٹ پینے سے روکتی ہیں۔ رات کو گھر سے باہر رہنے پر بھیا پر خفا ہوتی ہیں۔ امّی کو تو پولیس کے محکمے میں ہونا چاہیئے تھا۔

افسوس کی بات یہ تھی کہ اُن کی سُنتا کوئی نہیں تھا۔ بیچاری امّی! اصل میں وہ رحم دل بھی تھیں ہر ایک کا خیال بھی رکھتی تھیں۔ ہر ایک کی تکلیف پر تڑپ اُٹھتی تھیں۔ یہ الگ بات کہ اُن کا کوئی بھی خیال نہیں رکھتا تھا۔ اور تم دیکھو گے کہ اکثر وہ لوگ جو دوسروں کے لئے مرے جاتے ہیں اُن کی پرواہ کوئی نہیں کرتا۔ سلطان کو یہ احساس پریشان کئے دیتا تھا۔ اس کی عمر تو بے شک کم تھی۔ لیکن انگوٹھا چُوستے چُوستے بھی وہ گھر میں ہونے والے ڈرامے کے ہر سین کو بڑی گھمبیر سنجیدگی سے دیکھا کرتا تھا۔

اگلے دن سلطان اسکول گیا تو اُس نے اپنی کلاس کے تمام لڑکوں کو گراؤنڈ میں جمع پایا۔ اُسے حیرت ہوئی کیونکہ اُسے دیر ہو گئی تھی اور وہ ڈرتا جھجھکتا اسکول کے احاطے میں داخل ہُوا تھا۔

"فیضان کے ابّو کا انتقال ہو گیا ہے۔ ہم لوگ اُس کے گھر جا رہے ہیں۔ تم چلو گے؟" عامر نے سلطان کو آتا دیکھ کر آگے بڑھ کر پوچھا۔

فیضان کے گھر میں کہرام پڑا تھا۔ وہیں پتا چلا کہ اُس کے ابّو کو کینسر کا موذی مرض لاحق ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر کے منع کرنے پر بھی اُن کا سگریٹ پینا کم نہیں ہُوا تھا۔" فیضان کے کوئی عزیز کسی کو بتا رہے تھے۔

سلطان کو ایک جھٹکا سا لگا۔

کیا سگریٹ پینے سے کینسر ہو جاتا ہے اور جنہیں کینسر ہو جاتا ہے۔ کیا وہ مر جاتے ہیں۔؟

بہ یک وقت کئی سوالات اس کے ذہن میں اُبھرے۔ واپسی پر اُس نے ریاضی کے عارف سر سے اس قسم کی باتیں پوچھیں جو ان سب لوگوں کو لے کر گئے تھے۔

"کینسر ہونے کی وجہ تو معلوم نہیں ہو سکی ہے لیکن اس کا ایک سبب سگریٹ بھی ہو سکتا ہے۔ سگریٹ انسانی صحت کو تباہ کر دیتی ہے۔ آدمی دل کے مرض میں بھی مبتلا ہو جاتا ہے۔" سر عارف سگریٹ نوشی کے نقصانات پر روشنی ڈالتے رہے۔

"لیکن سر... جب سگریٹ اتنی بُری چیز ہے تو پھر لوگ اُسے کیوں پیتے ہیں؟" کسی نے پوچھا۔

"عادت... زیادہ تر لوگ اسے عادتاً پیتے ہیں۔ حالانکہ اس کا سراسر نقصان ہی ہے۔ صحت کا۔ روپے پیسے کا، ماحول کی آلودگی کا۔"

"حکومت کو اس پر پابندی لگا دینی چاہیے۔" ریاض نے تجویز پیش کی۔

"اب تک دنیا کے کسی ملک کی حکومت کو بھی سگریٹ نوشی پر پابندی لگانے کی ہمت نہیں ہو سکی ہے
اکثر ملکوں میں سگریٹ کے ڈبّے پر حکومت کی جانب سے یہ تحریر چھاپی جاتی ہے کہ "خبردار! سگریٹ نوشی صحت کے لیئے نقصان دہ ہے۔"

بعض ممالک میں عوامی جگہوں پر مثلاً بسوں وغیرہ میں سگریٹ پینا ممنوع ہے۔ شاید حکومتیں سگریٹ پر پابندی اس لیئے نہیں لگاتیں کہ حکومت کو ٹیکس ملتا ہے۔ ان کے خزانوں میں سگریٹوں کے عوض دولت جمع ہوتی ہے۔" سر عارف نے کہا۔

"سر لوگوں کی صحت کا خیال رکھنا بھی تو حکومت کی ذمّہ داری ہوتی ہے۔" جمیل نے لقمہ دیا۔

"تمہارا کہنا ٹھیک ہے۔ لیکن اپنی صحت کا خود خیال رکھنا بھی تو لوگوں کا فرض ہے۔ اگر انہیں اپنی صحت کی فکر نہیں ہوگی تو حکومت کہاں تک یہ ذمّے داری سنبھالے گی۔"

اسکول آچکا تھا اس لیئے یہ گفتگو ادھوری ہی رہ گئی۔ گھر واپس آتے ہوئے سلطان کا ذہن بار بار ایک ہی خیال سے اُلجھ رہا تھا۔ ابّو بھی تو سگریٹ پیتے ہیں اور کس کثرت سے پیتے ہیں۔ امّی کا کہا بھی نہیں مانتے۔ یہ تو بہت بُری بات ہے۔ اس کی نگاہوں کے سامنے فیضان کا زرد رو افسردہ چہرہ لہرا رہا تھا۔

دوست کے والد کی موت کا اثر سلطان کے دل پر کئی روز تک رہا۔ وہ انگوٹھا چُوستے ہوئے سوچتا رہا۔
اُسے اپنے پاپا سے کوئی بہت پیار نہ تھا۔ اس لیئے کہ انہوں نے خود بھی کبھی سلطان پر توجّہ نہیں دی تھی۔ البتہ وہ روزانہ اس کی لکھائی پڑھائی کے متعلق ضرور پوچھ لیتے تھے۔ کبھی کبھار اس سے سبق بھی سُن لیتے تھے۔ اس رات بھی حسبِ معمول جب وہ پڑھ رہا تھا۔ پاپا اس کے پاس آئے۔ ان کی انگلیوں میں سگریٹ سُلگ رہا تھا۔

"ہاں بھئی سلطان میاں، کیا ہو رہا ہے؟" انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں مُسکرا کر پوچھا۔ اس کا انگوٹھا منہ میں تھا۔ جلدی سے اُس نے ہاتھ پیچھے کی طرف ہٹایا۔ پاپا نے نوٹ کر لیا۔ آہستہ سے بیٹھ گئے۔ اور جب بولے تو لہجہ بدلا ہوا تھا سنجیدہ سا تھا۔

"سلطان میاں! ایک بات کہیں آپ سے۔"

"جی پاپا۔"

"اب آپ بڑے ہو گئے ہیں۔ منہ میں ہر وقت انگوٹھا دیئے رہنا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ اب آپ اس عادت کو چھوڑ دیجئے۔"

"جی!" وہ منمنایا

"لوگ دیکھ کر کیا سوچتے ہوں گے۔ پھر یہ بھی کہ یہ صحت کے لئے کتنی نقصان دہ بات ہے۔" پاپا رُک رُک کر بولے۔

"صحت کے لئے..." اُس نے دہرایا۔ بہت خُوب! تو پاپا کو صحت کا خیال رہتا ہے۔ صحت کی ان کے نزدیک کوئی اہمیت ہے۔ یہ تو اچھی بات ہے۔

"ہاں بیٹے۔ آپ کو اپنی صحت کی خاطر یہ عادت ترک کر دینی چاہیئے۔ نہ جانے روزانہ کتنے جراثیم آپ کے انگوٹھے کے ذریعے پیٹ میں چلے جاتے ہوں گے۔ ہم نے کبھی آپ سے کہا نہیں لیکن آج ہم آپ کو سختی سے منع کرتے ہیں۔"

"پاپا" اس نے کہا اور شاید کہنے کا صحیح موقعہ بھی یہی تھا۔ سگریٹ بھی تو صحت کے لئے نقصان دہ ہوتی ہے نا۔"

پاپا کچھ گڑبڑا گئے۔

"آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں۔" انھوں نے لڑکھڑا کر پوچھا۔

"پاپا میں انگوٹھا چوستا ہوں، آپ سگریٹ پیتے ہیں۔ ایک ہی بات ہے۔" اس نے بڑی جرأت سے کہا۔

"ہُوں..." پاپا نے ایک لمبی سانس کھینچی جیسے ان کی سمجھ میں سب کچھ آ گیا۔ پھر وہ اُٹھ کھڑے ہوئے کچھ دیر سوچتے رہے۔ پھر انہوں نے پُرتیقن انداز میں پکارا "سلطان بیٹے!

"جی پاپا"

"ایک معاہدہ کرو گے؟

"جی" وہ کچھ سمجھا کچھ نہیں سمجھا۔

"آؤ۔ آج سے ہم دونوں اپنی اپنی بُری عادتیں چھوڑ دیں۔ آئندہ سے نہ تم انگوٹھا چوسو گے اور نہ میں سگریٹ پیئوں گا۔

پاپا کا جملہ مکمل ہوتے ہی اُس نے بے اختیار ہاتھ اُٹھا کر اپنے انگوٹھے کو دیکھا۔ لعاب میں لتھڑا انگوٹھا اب بھی چمک رہا تھا۔ یک بہ یک اُس نے دیکھا کہ انگوٹھے کی پہلی پور میں فیضان کا زرد روافسردہ چہرہ جھلک رہا تھا۔ اس کے پاپا بھی تو سگریٹ کثرت سے پیتے تھے۔ کینسر دل کا مرض، گلے کی خرابی اور سینکڑوں امراض سگریٹ نوشی سے پیدا ہوتے ہیں۔" سر عارف کی آواز گونجی۔

"او کے پاپا... میں معاہدے کے لئے تیار ہوں" سلطان نے آگے بڑھ کر پاپا کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ پاپا نے اُس کا ہاتھ دبایا۔ پھر دونوں کی آنکھیں کسی نئے عزم سے مسکرا اُٹھیں۔

بُرا پھنسا

اپنی چھوٹی بہن "مریم" کو مسلسل انگوٹھا چوستے دیکھ کر" وحید ظفر شیخ" کا بے اختیار تاثر

مقدّر کو میں اپنے کوستا ہوں — خطا کیا تھی مری میں سوچتا ہوں
مری حالت پہ کچھ تو رحم کھاؤ — سزا میں کس کئے کی پا رہا ہوں
خدا کے واسطے چوسو نہ مجھ کو — میں کتنا پلپلا سا ہو گیا ہوں
اری مریم کی بچّی معاف کر دے — میں اس چُس چُس سے اب اُکتا گیا ہوں
انگوٹھا دوسرا بھی تو ہے آخر — اکیلا میں بھلا کیوں پھنس گیا ہوں
بہت خوش ہو مجھے منہ میں دبا کر — مگر میں غم میں گُھلتا جا رہا ہوں
میری حالت تو پتلی ہو گئی ہے — توانا کس قدر تھا ـــــ سوچتا ہوں
خدا کی نعمتیں ہیں اُن کو کھاؤ — مجھے چھوڑو میں کب سے رو رہا ہوں
کہیں بیمار نہ ہو جاؤ چندا — کہ میں اکثر بہت گندا رہا ہوں

سنو اس بات کو جو میں نے کی ہے
انگوٹھا چوسنا عادت بُری ہے

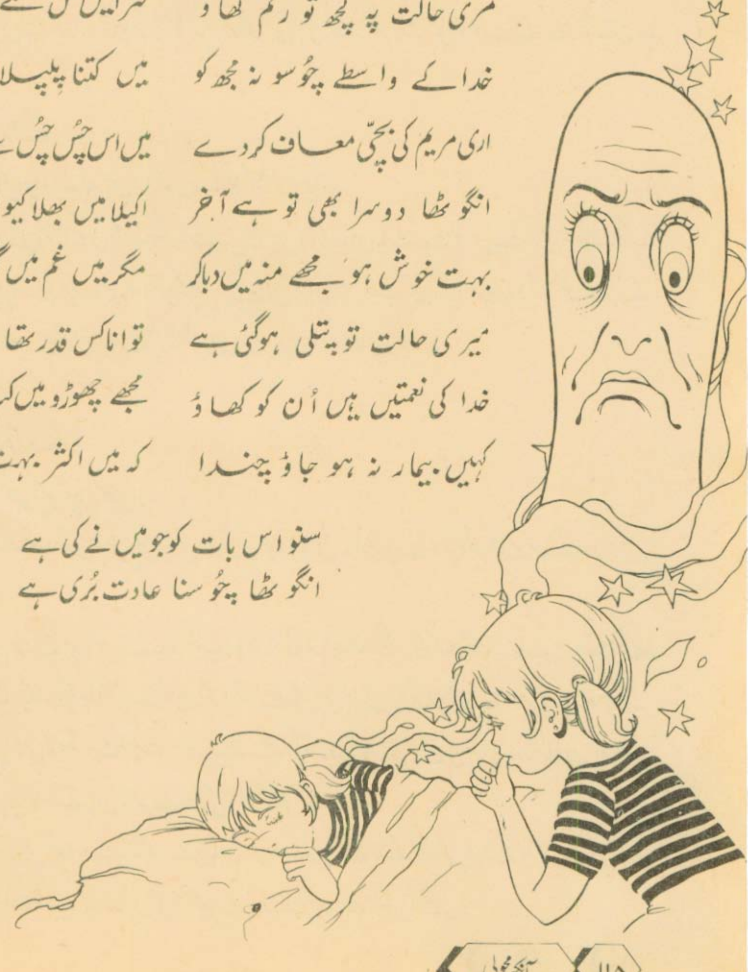

جُ سْ تُ جُ وْ
شَ رْ طْ ــــ ہَ ے

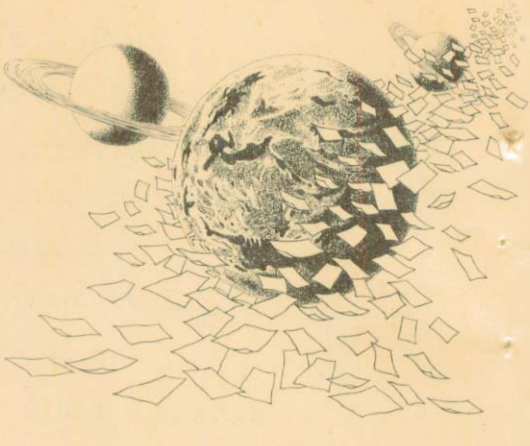

اسامہ بن سلیم

ذھانت اور معلومات

کا منفرد ماہانہ مقابلہ

آپ کی ذہانت کو کھُلا چیلنج دیتے ہوئے ہم "جستجو شرط ہے" لے کر آگئے ہیں۔ عقل کے گھوڑے علم کے میدان میں دوڑ لیئے اور ذراسی محنت اور جستجو سے اپنے جوابات تحریر کرکے ماہِ رواں کی ۱۰ر تاریخ تک ہمیں روانہ کر دیجئے۔ ہم منتظر ہیں۔ درست جواب کی صورت میں تین خوش نصیب بذریعہ قرعہ اندازی انعام پائیں گے جبکہ بقیہ کامیاب ہونے والے ساتھی داد وتحسین اور دسمبر کی اشاعت میں ان صفحات پر جگہ پائیں گے۔ شرکت کے لئے کوپن کا صفحہ اس شمارے کے صفحہ نمبر ۱ پہ علیحدہ سے دیا جارہا ہے۔ کوپن کے بغیر شرکت ممکن نہ ہوگی۔ شرکت کا طریقہ تو آپ کو معلوم ہے۔

ہم نے مطلوبہ جواب کے ہر حرف کو ایک ایک نام میں چھُپا دیا ہے، ہر لفظ سے ایک حرف چُنیں۔ اور جواب تک پہنچیں۔ جواب تک پہنچنے کے لئے شعر کا مصرعہ آپ کی مدد کرے گا۔ (اُسامہ بن سلیم)

۱ر آزادی کی خاطر جدّوجہد کرنے والے مشہور حریت پسندوں میں ایک معروف اور مقبول نام پوشیدہ ہے۔ تلاش کیجئے۔

۱ر محمّد علی جوہر ۲ر فیڈرل کاسترو ۳ر مقبول بٹ ۴ر یاسر عرفات ۵ر نیلسن منڈیلا
۶ر ابوندال ۷ر بھنڈرانوالہ

اشارہ ☆ دشمن سے نہ ڈرنے والا، سمت شمال میں لڑنے والا

۲۔ دنیا کے مشہور ریکارڈ ہولڈر کھلاڑیوں میں ایسے ہی ایک ریکارڈ ہولڈر کا نام تلاش کیجئے۔ جو آج کل شہرت کے آسمانوں پر ہے۔

۱۔ کیمبل وِیو ۲۔ بورس بیکر ۳۔ محمد علی کلے ۴۔ جہانگیر خان

اشارہ ☆ فٹ بال پہ کمال کا اس کو عبور ہے۔

۳۔ عالمی سطح پر شہرت پانے والے ماہناموں میں سے ایک مشہور ترین ماہنامہ؟ بتایئے تو اُس کا نام کیا ہے؟

۱۔ پاپولر سائنس (امریکہ) ۲۔ انڈیا ٹوڈے (بھارت) ۳۔ ریڈرز ڈائجسٹ (امریکہ) ۴۔ نیشنل جیوگرافک (امریکہ)

اشارہ ☆ زندگی کو کیمرے کی آنکھ سے دیکھے ہے یہ

۴۔ نیچے دیئے ہوئے مشہور ترین مخفف (انگریزی حروف) کو غور سے دیکھئے اور ہر مخفف سے ایک حرف چُن کر ایسا مخفف بنایئے جو یہاں ہمارا مطلوب ہے۔

۱۔ WHO ۲۔ APP ۳۔ PPI ۴۔ RCD ۵۔ NATO

اشارہ ☆ ساری اندھیر نگری تیرے دم سے ہے۔

۵۔ ساحل ساحل لنگر انداز ہونے والے دفاعی یا تجارتی بحری جہازوں میں ایک مشہور بحری جہاز کا نام تلاش کیجئے۔

۱۔ ٹیپو (پاکستان) ۲۔ ٹائٹانک (امریکہ) ۳۔ کوئین میری (امریکہ) ۴۔ تیمور (پاکستان)

اشارہ ☆ اپنے قلزم کو جو دیکھے وہ دشمن تو جُرم ہے۔

۶۔ سیاسی، معاشی یا دفاعی معاہدوں میں ایک معاہدہ تلاش کیجئے۔

۱۔ سینٹو ۲۔ ایکو ۳۔ ناٹو ۴۔ وارسا

اشارہ ☆ تشریف رکھیں آخری اک حرف ہٹا کر

۷۔ مذاہب عالم میں سے ایک مذہب... بتایئے تو کون سا ہے؟

۱۔ عیسائیت ۲۔ بدھ مت ۳۔ تاؤ ازم ۴۔ ہندو مت ۵۔ جین مت ۶۔ شنتو مت

اشارہ ☆ "عصا" سے نسبت ہے کس کو سوچو؟

۸۔ مشہور عالمی شہرت حاصل کرنے والے ناول نگاروں میں ایک بہت ہی مشہور ناول نگار کا نام تلاش کیجئے۔

۱۔ ای نِڈ سلائیمن ۲۔ ای ایم فاسٹر ۳۔ جیمز ھیڈلی چیز ۴۔ میکسم گورکی ۵۔ اگاتھا کرسٹی ۶۔ ایلکیس ھیلی ۷۔ لوئی لامور

اشارہ ☆ ٹائی اس نے جو باندھ لی میری، میں نے اُس کی پٹائی کر ڈالی

۹، مشہور یونانی دیوتاؤں اور دیویوں کے ناموں میں سے ایک نام یہاں پوشیدہ ہے آپ کی ذہانت اور علم اسے تلاش کر سکتا ہے۔

۱، کیوپڈ ۲، اولمپس ۳، جونو ۴، اٹلس ۵، ہرکولیس

اشارہ ☆ اُلٹ پُلٹ کے جو خود بھی پلٹو تو نام گم نام نہ رہے گا۔

۱۰، دنیا کی مشہور اور حسین وادیوں میں ایک مشہور تاریخی اور ثقافتی وادی تلاش کیجئے۔ بہت مشہور نام ہے بار ہاسنا ہوا۔

۱، نیلم ۲، ہُنزہ ۳، چترال ۴، سوات ۵، کاغان

اشارہ ☆ تہذیبوں کی دھرتی ہے یہ کس دریا کی وادی ہے؟

"جستجو شرط ہے" ماہ اکتوبر کے درست جوابات

۱۔ امونیا۔ ۲۔ سارک ۳۔ معکوس ۴۔ ٹرام

۵۔ داغ ۶، ننکن ۷، مکران ۸۔ کارلوس

۹۔ ثمرقند ۱۰۔ جدی

تین انعام پانے والے خوش نصیبوں کے نام

۱۔ اسد حمید۔ دستگیر کالونی، کراچی ۲۔ منصور احمد۔ پشاور ۳۔ تابندہ ریاض۔ باغبانپورہ لاہور۔

درست جواب ارسال کرنے والے ساتھیوں کے نام

محمد فیصل ۔ سندھی ہوٹل، نئی کراچی
صباحت حبیب ۔ منگو پیر روڈ کراچی
صبا ناز ۔ بفرزون ۔ نارتھ کراچی
ہما انجم ۔ ماڈل کالونی کراچی
عظمیٰ ادریس ۔ رامسوامی کراچی
عائلہ ناہید عالی ۔ ناظم آباد کراچی
دمیر اشفاق انصاری ۔ گلشن اقبال کراچی
عدیل عالم خان منگو پیر روڈ
فاروق بشیر ۔ پاپوش نگر کراچی
محمد عمر فواد ۔ سعود آباد ملیر کراچی
شیریں صمد ۔ آدم ٹاؤن نئی کراچی
بلال اشفاق انصاری ۔ گلشن اقبال کراچی
مرزا فرخ بیگ ۔ ایئرپورٹ ۔ کراچی
عاصم حسین ۔ قلعہ چوک ٹنڈو الہٰ یار
وقار حسن ۔ بہاولپور

عدنان فاروقی ۔ فیڈرل بی ایریا کراچی
محمد سلیمان فاروقی ۔ نارتھ ناظم آباد کراچی
افشین حمید ۔ فیڈرل بی ایریا کراچی
نوید حمید ۔ فیڈرل بی ایریا کراچی
سید محمد نسیم نقوی ۔ نارتھ کراچی
ہما ناز ۔ عزیز آباد کراچی ۔
قیصر محمود ۔ لطیف آباد ۔ حیدرآباد
ظہیر الٰہی بابر ۔ ریلوے کالونی ۔ حیدرآباد
سمیرا ناز شیخ ۔ لطیف آباد ۔ حیدرآباد
بابر جاوید ۔ لطیف آباد ۔ حیدرآباد
عامر ارشاد ۔ لطیف آباد ۔ حیدرآباد
شبیر حسن نجیب شوگر مل نواب شاہ
عاشق حسین نازش ۔ نوید کلینک سیجھورو
فیصل مختار صدیقی ۔ کیڈٹ کالج پٹارو دادو ۔

نعیم فاطمہ خان ۔ سیٹلائٹ ٹاؤن بہاولپور
رابعہ علی ۔ ٹاؤن شپ لاہور
خالد خلیل احمد ۔ سمن آباد ۔ لاہور
محمد زبیر ۔ گلبرگ کینال پارک ، لاہور
ممتاز علی راہمول ۔ گوٹھ بنات "تھر"
عصمت رضا ملک ۔ چمنی محلہ بھکر
اکبر منیر ۔ سیکٹر ۔ جی ۔ اسلام آباد
بلال ظفر ۔ سیکٹر جی ۔ اسلام آباد
آصف وقار آصف ۔ لالہ رخ واہ کینٹ
ذکیہ امبرین شکیل ۔ پتہ نہیں لکھا
غلام عباس پنہور ۔ گولارچی (سندھ)
ارم فاطمہ ۔ پاکستان چوک ۔ فیصل آباد
محمد عمران قادر ۔ محلہ آسن داس ٹنڈو آدم
محمد فیصل محلہ قلعہ چوک ٹنڈو الہٰ یار

آزمائیے

زبان، ذہانت اور ظرافت؟

ہم آپ کی زبان ، ذہانت اور ظرافت کا امتحان لے رہے ہیں
کوئی دلچسپ لطیفہ ، کوئی ہنسانے والی بات ، کوئی قہقہاتا واقعہ اس طرح لکھیے کہ پوری تحریر میں کہیں کوئی **نقطہ** نہ آنے پائے ۔
بے نقط لطیفے پر ہم داد و تحسین کے علاوہ انعام بھی دیں گے ۔ مگر شرط صرف یہی ہے کہ

لطیفہ دلچسپ ہو ۔ اظہار موزوں ہو
جملے محدود ہوں (کسی بھی لطیفے کے برابر) ۔ اور نقطہ کہیں آنے نہ پائے ۔

"مقابلۂ لطیفہ" آنکھ مچولی ۔ ۱۱۲ ۔ ڈی ۔ سائٹ کراچی

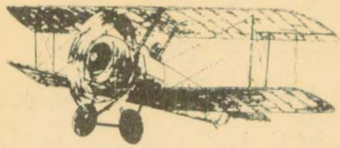

اُڑن کھٹولا

ساجد سعید

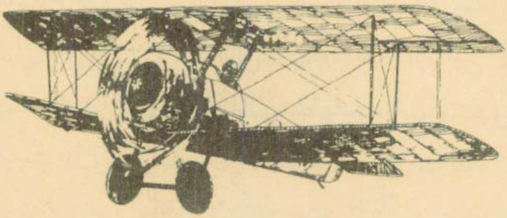

دُنیا کو پر پرواز دینے والوں کا قصّہ

یہ ۱۸۷۸ء کی ایک صبح کا ذکر ہے۔ سورج نے آس پاس کے علاقوں کو اپنی روشنی کے دائرے میں لے رکھا تھا۔ ایسے میں ایک پادری اپنے ہاتھ میں ایک مشینی کھلونا لئے اپنے گھر کی طرف رواں دواں تھا۔ یہ کھلونا اُس نے اپنے دو بیٹوں کے لئے لیا تھا۔ گھر میں داخل ہونے کے بعد اُس کے دونوں بیٹے جو اپنے ڈیڈی کے انتظار میں بیٹھے تھے اُن کو دیکھتے ہی اُن کے چہرے خوشی سے کھل گئے۔

"لو بچو! تم لوگوں کے لئے کھلونا" پادری نے اپنے بیٹوں کی جانب وہی مشینی کھلونا اُچھال دیا۔ مگر وہ کھلونا اُن کی جانب جانے کے بجائے مخالف سمت میں اُڑنے لگا۔ اور چند لمحے گردش کرنے کے بعد زمین پر گر پڑا۔ یہ دونوں لڑکے اُس کھلونے سے کھیلتے رہے۔ یہ کھلونا "بانس" اور کاغذ کا بنا ہُوا تھا۔ کیونکہ ان کے پاس اتنے پیسے نہ تھے کہ وہ اس طرح کا کوئی دوسرا کھلونا لیتے۔ چنانچہ انھوں نے اسی طرح کا کھلونا بنانے کا فیصلہ کیا۔ اس کے علاوہ یہ دونوں بھائی فضا میں اُڑنے والی پتنگیں بھی بناتے جو بہت پسند کی جاتی تھیں۔

شاید آپ پہچان گئے ہوں گے کہ یہ دونوں بھائی عظیم موجد ولبر رائٹ اور اورول رائٹ تھے۔ جن کو دُنیا رائٹ برادران کے نام سے یاد کرتی ہے۔ انھوں نے جہاز ایجاد کر کے دنیا میں ایک ایسا انقلاب

برپا کیا جس نے نہ صرف فاصلوں کو محدود کیا بلکہ اور بہت سی مشکلیں آسان کیں۔

ولبر رائٹ اور اورول رائٹ بالترتیب ۱۶ اپریل ۱۸۶۷ء اور ۱۸۷۱ء کو انڈیانا اور اوہایو کے مقام پر پیدا ہوئے۔ دونوں بھائیوں کے دل میں اُس وقت سے ہی کوئی ایسی مشین ایجاد کرنے کی خواہش تھی جو اُڑ سکے۔ جب سے اُن کے والد نے اُن کو اُڑنے والا مشینی کھلونا لاکر دیا تھا۔ وہ اکثر چیلوں اور کبوتروں کو دیکھا کرتے جو پَر پھیلائے فضا میں آزادی سے اُڑ رہے ہوتے تھے۔ وہ اپنی معاشی حالت کو بہتر بنانے کے لیے پتنگیں بھی بناتے جو بہت پسند کی جاتی تھیں۔ اُنہی دنوں اخبار میں انھوں نے ایک انجینئر اوٹو لینن کے ہلاک ہونے کی خبر پڑھی جو پرواز کے دوران ہلاک ہوگیا تھا۔ اوٹو لینن کئی سالوں سے اپنے دونوں شانوں سے بڑے بڑے پَر نما باندھ کر پہاڑی سے نیچے کی جانب اُڑنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ اوران کوششوں کی وجہ سے وہ اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ اس کی ہلاکت سے رائٹ برادران کو بڑا صدمہ ہوا۔ اُن دونوں نے فوری طور پر وہ تمام مضامین کی فہرست واشنگٹن سے سمتھ سونٹن کے ادارے کو لکھ کر منگوالیں جس میں اُڑن مشین کے بارے میں تفصیلات تھیں۔ وہ ان مضامین کو بڑی توجہ سے پڑھنے لگے۔ اور آخر کار چار سال تک مطالعہ کرنے کے بعد انھوں نے ایک پتنگ نما صندوق بنانے کا فیصلہ کیا۔

اس پر ان کے تین پونڈ خرچ ہوئے اس کے دو حصّے تھے جو ایک دوسرے کے اُوپر واقع تھے اس میں انجن بھی نہ تھا۔ رائٹ برادران نے اس پتنگ نما صندوق میں اُڑنے کے سلسلے میں محکمۂ موسمیات کے دفتر سے معلوم کیا کہ کون سی جگہ اُڑنے کے لیے بہتر ثابت ہوگی پتا چلنے پر معلوم ہوا کہ شمالی کیلی فورینا کی جگہ مناسب ہے۔ ان دونوں بھائیوں کی یہ پہلی پرواز کامیاب نہ ہوسکی۔ کیونکہ وہ ہوا میں چند سیکنڈ بھی مشکل سے رہ سکے اس کے بعد انھوں نے اس سے بڑا صندوق بنایا۔ اس مرتبہ بھی کوئی حوصلہ افزا نتائج برآمد نہ ہو سکے ان دو ناکامیوں کی وجہ سے وہ دل برداشتہ ہوگئے اور انہوں نے یہ اعلان کروادیا کہ "انسان ہزاروں برس تک ہوا میں پرواز نہ کر سکے گا" ممکن ہے کہ ان کا یہ اعلان آج بھی حقیقت کے روپ میں زندہ ہوتا اگر ایک انجینئر ان کو سیدھا راستہ نہ دکھاتا تو شاید ہم آج ہزاروں میل کا سفر گھنٹوں میں طے نہ کر پاتے۔ اس انجینئر نے اُڑن مشینوں کے بارے میں ایک کتاب بھی لکھی تھی۔ اس نے دونوں بھائیوں کی رہنمائی کی اور اُن کو شکاگو ویسٹرن سوسائٹی آف انجینئرز کے سامنے تقریر کرنے کی دعوت دی، ولبر رائٹ نے اُن تمام نظریوں کو غلط قرار دیا جس میں سائنسدانوں نے جہاز کے متعلق نقشے بنائے تھے۔ اس کے برعکس اورول نے ایک لکڑی کا صندوق لیا اور اُس کا منہ دو اطراف سے کھول دیا اُس کے ایک طرف ہوا پیدا کرنے کے لئے ایک مشینی پنکھا

لگا دیا. اور اس کے منہ میں شیشہ چسپاں کر دیا اور اندر جھانک کر دیکھا تاکہ یہ معلوم کر سکے کہ ہوا اس چھوٹے سے جہاز پر کیا اثر کرتی ہے ۔ اس کا یہ تجربہ کامیاب رہا اور اُس نے سائنسدانوں کے جمع شدہ اعداد و شمار اور نقشوں کو غلط ثابت کر دیا ۔ انھوں نے اپنے اس پہلے کامیاب جہاز میں پٹرول سے چلنے والا انجن نصب کرنے اور برقی تاروں کے ذریعے اُسے جہاز کے پنکھوں کے ساتھ جوڑنے والا اپنا خود کار ایک انجن بنایا جس پر اُن کے ۱۶۰ پونڈ خرچ ہوئے ۔

اس ہوائی جہاز کے ذریعے انھوں نے ۱۹۰۳ء میں شمالی کیلی فورنیا میں پہاڑی کے مقام پر پہلی بار پرواز کی۔ دس بج کر پینتیس منٹ میں انہوں نے جہاز کا انجن آن کر دیا ۔ مشین کے دہانے سے باہر کی جانب شعلے لپکنے لگے ۔ اور ہوا سے اس بھاری مشین نے ۱۷۵ فٹ کی پرواز ۲۰ سیکنڈ میں مکمل کی ایک سال کے اندر انھوں نے مزید اس میں بہتری پیدا کی اور اس کے بعد انھوں نے ۸۰۰ فٹ کا فاصلہ طے کیا ۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ان دونوں بھائیوں کی اس عظیم ایجاد کے بارے میں اخبارات نے خبر شائع نہ کی جو ایک افسوسناک بات تھی ۔

آج سینکڑوں اقسام کے جہاز جو سفر کرنے سے لے کر جنگی مقاصد تک کے لئے بنائے گئے ہیں . دنیا میں انقلاب برپا کئے ہوئے ہیں اور ہواؤں کے دوش بدوش پرواز کر رہے ہیں۔ یہ اُن دونوں بھائیوں کی انتھک محنت اور کاوش کا نتیجہ ہے ۔

ولبر رائٹ کا ۱۹۱۴ء میں ٹائیفائڈ بخار سے انتقال ہوا لیکن اورول رائٹ ۱۹۴۸ء تک زندہ رہا ۔ اُن کی پہلی پرواز صرف چند سیکنڈ کی تھی، لیکن اب وہی چند سیکنڈ تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں ۔

سفر مبارک

معلومات بھی ——— رہنمائی بھی

حجّاج اور زائرین کے لیے نادر تحفہ!

۲۰۳ صفحات

یہ کتاب آپ صرف ۲ روپے کے ڈاک ٹکٹ ارسال کرکے حاصل کرسکتے ہیں

سیرتِ طیبہؐ پر لکھی جانے والی معرکتہ الآرا کتاب جسے بطورِ خاص

بچّوں اور طالب علموں کے لیے تحریر کیا گیا

مشہور محقّق سیّد نظر زیدی کا تحفۂ خاص، جس نے صدارتی ایوارڈ حاصل کیا

سب سے بڑا انسانؐ

- سیرتؐ کے موضوع پر بیش بہا معلومات
- عام فہم، آسان اور دلنشیں اندازِ تحریر
- ۱۹۰ حسین آفسٹ صفحات،
- دلکش کمپوزنگ، عمدہ طباعت
- چار رنگوں کا حسین اور لیمینیٹڈ سرورق

الحمدللہ

اس خوبصورت کتاب کو شائع کرنے کی سعادت ادارۂ آنکھ مچولی ۔گرین گائیڈ اکیڈمی نے حاصل کی۔

ھدیہ :- ۴۰ (چالیس روپے) (منی آرڈر یا پوسٹل آرڈر کی شکل میں بھجوائیں)

ڈاک خرچ ادارے کے ذمّے ہوگا۔

نوٹ

طلبہ وطالبات اپنے ادارے کے شناختی کارڈ کی فوٹو اسٹیٹ بھجوا کر یہ کتاب آدھی قیمت میں حاصل کرسکتے ہیں

کتاب منگوانے کا پتہ :-

"سب سے بڑا انسان" گرین گائیڈ اکیڈمی ۔ ڈی ۔ ۱۱۲ ۔ سائٹ کراچی نمبر ۱۶

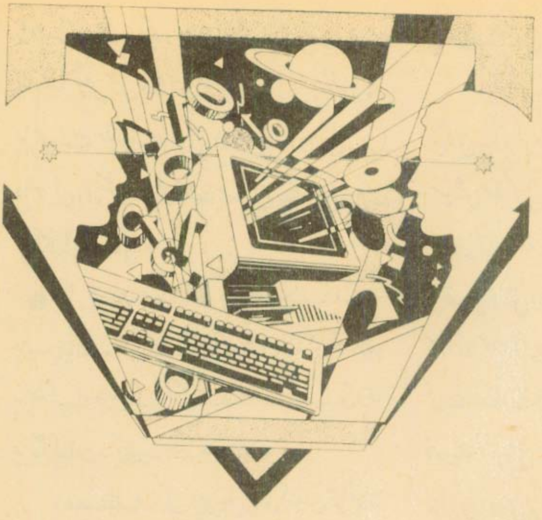

سائنس انکوائری

سائنسی موضوعات پر

آپ کے سوالات اور ان کے جوابات

سید ایاز محمود

● میں نے سُنا ھے کہ بجلی سے چلنے والی موٹر گاڑیاں ایجاد ہو چکی ہیں۔ پاکستان میں ایسی گاڑیاں کب تک آئیں گی۔؟ ملک محمد جہانگیر مسعود۔ فیڈرل بی ایریا۔ کراچی

حقیقت پوچھئے تو ہم تو چاہیں گے کہ ہمارے وطن میں جلد ہی ایسی گاڑیوں کی آمد ہو جو بجلی سے چلتی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ یہ دُھواں نہیں دیتی۔ ان میں شور نہیں ہوتا اور تیل کے مقابلے میں بجلی نہایت سستی پڑتی ہے۔ لہٰذا خرچہ بھی کم۔ ذرا سوچئے تو سہی کہ دوپہر دو بجے بندر روڈ کراچی پر آپ چلے جا رہے ہوں اور وہاں نہ دھواں ہو نہ گاڑیوں اور بسوں کا شور شرابا۔

برطانیہ میں ۴۵،۰۰۰ موٹر گاڑیاں بجلی سے چل رہی ہیں۔ یہ گاڑیاں دراصل سامان کی ترسیل پر معمور وینز Vans ہیں۔ ان میں دودھ لے جانے والی گاڑیاں بھی شامل ہیں اور ڈاک فراہم کرنے والی بھی۔

یہ برقی موٹر گاڑیاں، بیٹری سے چلتی ہیں جسے روزانہ چارج کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اور ان کو چارج کرنے میں ایسی کون سی قباحت ہے۔ بیٹری سے ایک تار جوڑا اور تار کا دوسرا سرا گھر میں بجلی کے پلگ سے منسلک کر دیا۔ رات بھر بیٹری چارج ہوتی رہے گی اور صبح گاڑی آپ کو تیار ملے گی۔ مشکل ہے تو فقط یہ کہ برقی گاڑیوں کو چلانے کے لیے جن بیٹریوں کی ضرورت پڑتی ہے اُن کا سائز اور وزن بہت زیادہ ہوتا ہے اور گاڑی نہایت وزنی ہو جاتی ہے۔ ان گاڑیوں کی زیادہ سے زیادہ رفتار ۵۰ میل فی گھنٹہ ہے اور یہ ایک مرتبہ چارج ہونے کے بعد ۷۰ میل کا سفر طے کر سکتی ہیں۔ گویا آپ کو کراچی سے حیدر آباد جانا ہو تو راستے میں ایک

رات کے لئے رکھیے اور بیٹریاں چارج کیجئے۔ یہ تمام قباحتیں جس روز ختم ہو جائیں گی۔ ایسی گاڑیاں تیزی سے مقبول ہوں گی۔ اور ان کی بدولت دنیا دھوئیں اور شور کے بڑے مسائل سے کسی حد تک چھٹکارا پالے گی۔

● کراچی میں بعض گھروں میں ہم نے بہت بڑے پیالہ نما انٹینا لگے دیکھے ہیں۔ یہ کن اصولوں پر کام کرتے ہیں۔ کیا ان کی مدد سے دنیا بھر کے ٹی وی پروگرامات دیکھے جا سکتے ہیں؟

(مصطفینہ عاکف، یونیورسٹی کیمپس کراچی)

پیالہ نما انٹینا جنہیں اصطلاحاً ڈش انٹینا کہا جاتا ہے۔ اب عام ہوتے جارہے ہیں۔ ان کی مدد سے ہم دُنیا بھر کے پروگرام گھر بیٹھے اپنے ٹی وی سیٹ پر دیکھ سکتے ہیں۔

یہ تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ریڈیائی لہریں جن پر ٹی وی پروگرام نشر کیے جاتے ہیں۔ یہ لہریں بالکل سیدھی سفر کرتی ہیں جبکہ دنیا گول ہے۔ اس لیئے یہ لہریں ایک خاص حد تک کارگر ثابت ہوتی ہیں۔ زمین کی قدرتی گولائی اور دوسری رکاوٹیں ٹی وی کی نشریات کا دائرہ محدود کر دیتی ہیں۔ ان نشریات کا دائرہ وسیع کرنے کے لئے ضروری ہے کہ طاقتور ٹرانسمیٹرز کے ذریعے نشریاتی سگنل کو زمین کے مدار میں ۲۲ ہزار میل کی دُوری پر گردش کرتے ہوئے مصنوعی سیارے میں موصول کروایا جائے اور پھر یہاں سے ترسیل شدہ سگنل کو دُور دراز کے زمینی اسٹیشن پر وصول کر کے آپ کے ٹی وی پر دکھا دیں۔ ایک مصنوعی سیارہ

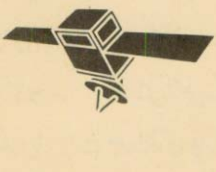

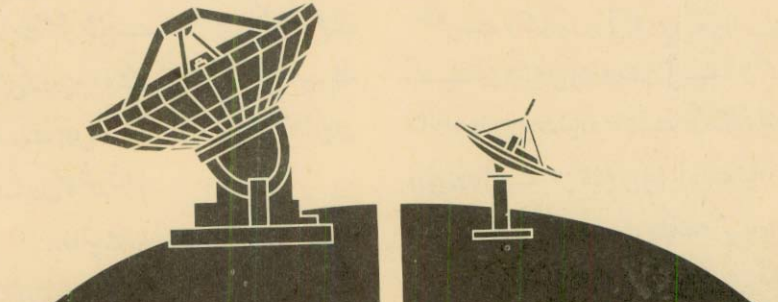

دُنیا کے ایک تہائی حصّے کو اپنی زد میں لے سکتا ہے لہٰذا ایسے تین سیّاروں پر مشتمل ایک عالمی مواصلاتی نظام قائم کیا جا سکتا ہے۔

مصنوعی سیّاروں سے ترسیل شدہ سگنلز عام ٹی وی اینٹینا کے لیے نہایت کمزور ہوتے ہیں لہٰذا ہمارا ٹی وی ان کو نشر کرنے سے قاصر ہے۔

ڈش اینٹینا میں خاص قسم کے حسّاس آلات نصب ہوتے ہیں جو ان سگنلز کو موصول کر کے ہمارے ٹی وی پر دکھا دیتے ہیں اور یُوں ہم یورپ، امریکہ اور دُور دراز مُلکوں کے پروگرامات گھر بیٹھے اپنے ٹی وی پر دیکھ سکتے ہیں۔

● اینٹی سیپٹک سے کیا مُراد ہے؟ رضوان حیدر
آزاد کشمیر۔ زیبا شہناز۔ لاہور۔

اینٹی سیپٹک یا جراثیم کُش ادویہ سے مراد ایسے مادّے ہیں جو کسی بھی مرض کے جراثیم ختم کرتے ہیں یا بیکٹیریا کو کمزور کرتے ہیں۔ دُودھ یا پانی کو اُبال لیا جائے تو یہ بھی ایک طرح کا جراثیم سے محفوظ رہنے کا علاج ہے۔ اینٹی سیپٹک کا اہم کام یہی ہے کہ وہ انسانی تکلیف کو بہت حد تک کم کر دیتی ہیں۔ جرّاحی کے عمل سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ڈاکٹر اپنے آلات۔ پٹّیوں وغیرہ کو صاف کرے اور جرّاحی کے بعد اپنے ہاتھوں اور دستانوں کو اچھی طرح ڈھو ڈالے۔

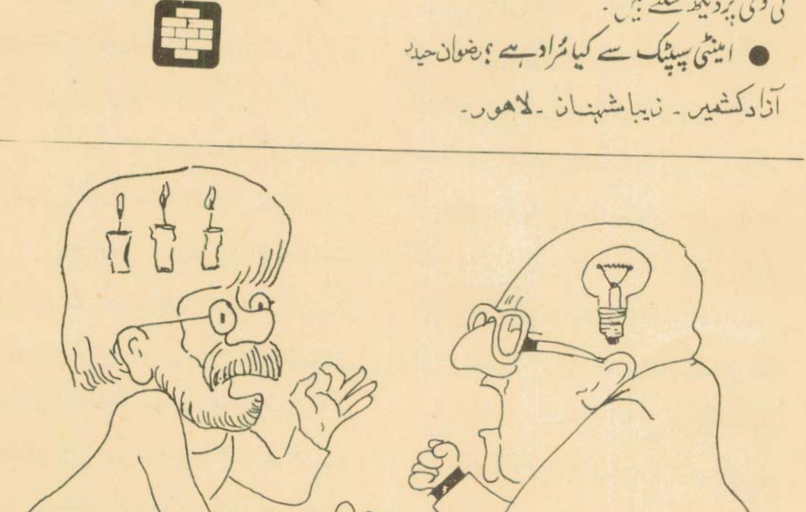

ماضی اور حال کے دو روشن دماغ سائنس داں

لیزر شعاع کیا ھوتی ھے۔ یہ کن شعاؤں کا مجموعہ ھوتی ھے اور یہ کس مقصد کے لئے استعمال ھوتی ھے؟ سہیل ریاض۔ گورونانک پورہ۔ فیصل آباد

سب سے پہلے تو یہ جان لیجئے کہ لیزر Light Amplibication By Stimulated emmission of Radiation کا مخفف ہے

لیزر ایک نہایت طاقتور روشنی ہے۔ اس کی شعاع کو نہایت باریک نقطہ پر مرتکز کرکے اس کی توانائی کو اس حد تک بڑھایا جاسکتا ہے کہ دس لاکھ درجہ سینٹی گریڈ تک درجۂ حرارت حاصل کیا جاسکے۔ یہ بہت زیادہ تپش ہے اور اس کی زد میں آکر کوئی شے بھی اپنی اصل حالت برقرار نہیں رکھ سکتی۔

یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ روشنی لہروں کی صورت میں سفر کرتی ہے اور ان لہروں کو طول موج Wave Length میں ناپا جاسکتا ہے۔ عام قسم کی روشنی مختلف طول موجوں اور رنگوں پر مشتمل ہوتی ہے اور اسی لیے اس کا زیادہ تر حصہ آپس میں ٹکرا کر ہی فنا ہوجاتا ہے۔ لہٰذا عام روشنی میں اتنی قوت بھی نہیں ہوتی کہ وہ ایک کاغذ کے ٹکڑے کو ہی جلاسکے۔ لیزر شعاعوں کا طول موج اور رنگ یکساں ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ بہت طاقتور ہوتی ہیں۔ اور لوہے کی چادروں تک کو پگھلا کر رکھ دیتی ہیں۔

آپ نے لیزر کا استعمال پوچھا ہے تو بھئی اس کے لامحدود کام ہیں۔ یہ طب، جراحی، مواصلات انجینئرنگ، صنعت، تعلیم اور دفاع کی شعبوں میں اپنی اجارہ داری قائم کرچکی ہے۔ کپڑے کی نہایت نفیس کٹائی کے لئے بھی لیزر شعاع کا استعمال کیا جارہا ہے۔

راڈار کس طرح کام کرتا ھے اور راڈار کا مطلب کیا ھے؟ عمر خطاب خان صنم، اورنگی کراچی۔ ارسلان ظہیر، محلہ غریب پورہ گجرات

راڈار Radio Detection And Ranging (Radar) کا مخفف ہے۔ یہ ایک آلہ ہے جس کے ذریعے سے ریڈیائی لہروں کو فضا میں پھینکا جاتا ہے۔ یہ لہریں چھوٹے طول موج کی ہوتی ہیں اور اندھیرے، کہر گرد و غبار اور بادلوں کے پار گزر جاتی ہیں۔ ان کا راستہ صرف ٹھوس اجسام ہی روک سکتے ہیں۔ جن سے ٹکرا کر یہ واپس لوٹتی ہیں اور ریڈار کے پردے پر ایک نشان بنادیتی ہیں۔ یہ نشان راستے میں حائل جسم کی موجودگی اور اس کی ساخت کی نشاندہی کرتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ جس جسم کی نشاندہی ہوتی ہے اس کے درست مقام اور فاصلہ کا بخوبی تعین بھی کیا جاتا ہے۔

راڈار کا اوّلین استعمال دوسری جنگ عظیم کے دوران ہوا۔ اس کی مدد سے برطانوی فوجوں نے جرمن ہوائی جہازوں کا کھوج لگایا۔ ابھی جرمن جہاز اپنے ہدف سے میلوں دور ہوتے کہ راڈار کے ذریعے ان کی آمد کی پیشگی اطلاع مل جاتی اور یوں تمام حفاظتی انتظامات پہلے ہی سے کرلئے جاتے۔

راڈار زمانۂ امن میں بھی بہت کام آتا ہے۔ آج کل کے دور میں اس کے بغیر بحری اور برّی سفر تقریباً ناممکن ہے۔

انسانوں کی طرح بعض جانور بھی راڈار کا استعمال جانتے ہیں۔ مثلاً چمگادڑ کے بارے میں کہا جاتا ہے۔ کہ وہ دیکھ نہیں سکتی۔ اُڑتے وقت وہ اپنے منہ سے ایک خاص قسم کی صوتی لہریں پیدا کرتی ہے جو ٹھوس اشیائے سے ٹکرا کر واپس آتی ہیں اور چمگادڑ کے جسم میں موجود قدرتی راڈار اس کو مطلع کر دیتا ہے کہ راہ میں کوئی چیز حائل ہے۔ یہی راڈار کا اصول ہے۔

محمّد بن موسیٰ الخوارزمی

دنیائے علم میں محمّد بن موسیٰ الخوارزمی کا نام ایک عظیم ریاضی دان اور ماہرِ فلکیات کے طور پر ہمیشہ زندہ رہے گا۔ یہ ایک سے نو تک گنتی کے اعداد کو الگ الگ لکھنے والا پہلا شخص ہے اور اس کو اس کارنامے پر دُنیا کا عظیم ترین سائنس دان کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

عہدِ اسلامی کا یہ نامور سپوت ۷۸۰ء میں ترکستان کے جنوبی علاقہ خوارزم میں پیدا ہُوا اور اسی مناسبت سے اسے الخوارزمی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

ہندسوں کی ایجاد کا کارنامہ اس قدر اہم ہے کہ ان کے بغیر موجودہ سائنسی دور کا وجود بھی نہیں ہوتا۔ خیال کرو، سائنسی تاریخ کا سب سے بڑا کارنامہ کسے تسلیم کیا جاتا ہے۔ کمپیوٹر کی ایجاد یا چاند کی تسخیر کو! کمپیوٹر تو کھیل ہی ہندسوں کا ہے اور کوئی بھی خلائی مہم انتہائی درجہ کی منصوبہ بندی کے لئے علمِ ہندسہ کی محتاج ہے۔

الجبرا کا مضمون پڑھنے والے بچّوں کو شاید یہ علم نہ ہو کہ الجبرا بھی الخوارزمی ہی کی ایجاد ہے۔ اس نے الجبرا کا نام الجبر والمقابلہ تجویز کیا تھا جو بعد میں مختصر ہو کر الجبرا کہلایا۔ اس کے علاوہ لگورتھم بھی اسی کی ایجاد ہے۔

خوارزمی نے دیگر مضامین مثلاً فلکیات ستاروں اور سیاروں کا علم / علمِ مثلث اور جغرافیہ وغیرہ میں بھی مہارت حاصل کی لیکن بحیثیت ریاضی دان اور الجبرے کے موجد۔ اس کی خدمات کا اعتراف رہتی دنیا تک کیا جائے گا۔

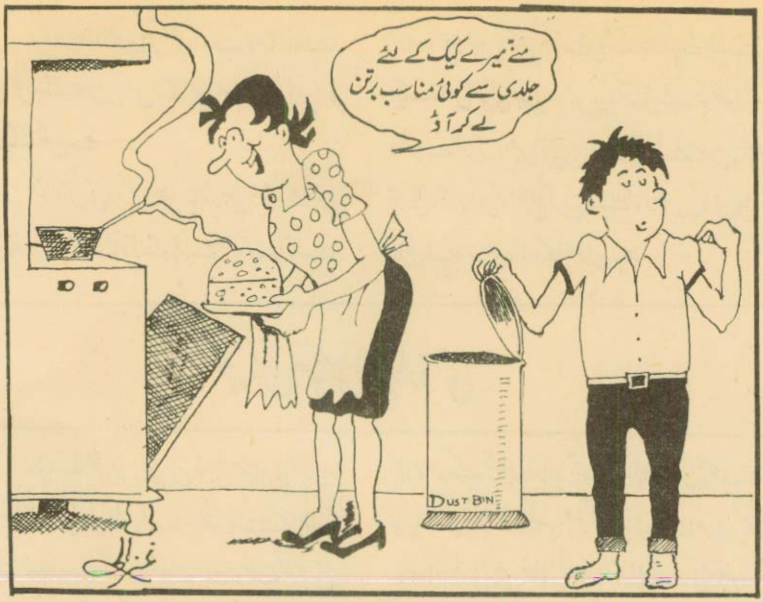

آنکھ مچولی کے لئے سلمان غزالی کی شوخ لکیریں

دنیا میرے آگے

دلچسپ حیرت انگیز اور تصویری خبر نامہ

جسے اللہ رکھے

گاڑیوں کے ڈھانچوں کو دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے یہاں بم کا کوئی دھماکہ ہوا ہے۔ مگر صحیح صورتِ حال یہ ہے کہ امریکی ریاست وسکنسن میں ہائی وے پر ۲۳ گاڑیاں آپس میں اس طرح ٹکرائیں کہ پندرہ آدمی معمولی زخمی ہوئے۔ مگر جانی نقصان نہ ہوا۔ یہ حادثہ دوپہر کے وقت پیش آیا۔ حادثے کے تھوڑی دیر بعد ہی پچاس سے زائد فائرمین اور پولیس کے سپاہی جائے حادثہ پر جمع ہو گئے۔ ان کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ آپس میں گتھم گتھا ہوتی والی گاڑیوں سے زخمیوں کو نکالنے کا تھا۔ ہائی وے حادثے کے بعد جام ہو چکا تھا۔ چنانچہ ایک اور بڑا مسئلہ

گاڑیوں کو ہٹانے کا بھی تھا۔ تاکہ ہائی وے پر ٹریفک کو رواں کیا جا سکے۔ اس مقصد کے لئے بیس ٹرکوں کے ذریعے ٹریفک کلیئر کیا گیا۔ اخباری نمائندوں سے باتیں کرتے ہوئے شیرف کے ڈپٹی نے بتایا کہ حادثے کی اصل وجہ یہ تھی کہ ہر گاڑی کا ڈرائیور انتہائی تیز رفتاری کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ مگر ہم کسی بھی ڈرائیور کا چالان نہیں کر سکتے کیونکہ یہ سب لوگ اس وقت چلنے والی آندھی سے بچنے کے لئے وہاں سے تیزی سے گزرنے پر مجبور تھے۔

اُڑن ٹریکٹر

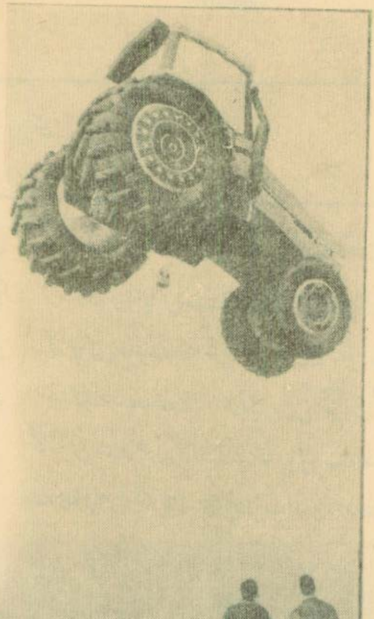

یہ کسی سائنس فکشن فلم کا منظر نہیں ہے بلکہ برسٹل (برطانیہ) میں بنایا گیا ٹریکٹر نما غبارہ ہے۔ دوسری تصویر میں آپ دیکھ سکتے ہیں کہ اس "اُڑن ٹریکٹر" میں سوار ہونے کے لئے کچھ لوگ بیٹھ رہے ہیں۔ یہ اُڑن ٹریکٹر ۱۳۱ فٹ لمبا ۷۲ فٹ چوڑا اور ۹۵ فٹ اونچا ہے۔ اس کی قیمت ۵۰ ہزار ڈالر ہے۔ اسے کینیڈا کی ایک فرم "کیس انٹرنیشنل ٹریکٹرز آف کینیڈا" کے لئے تیار کیا گیا ہے تاکہ کمپنی کی تشہیر کی جا سکے۔

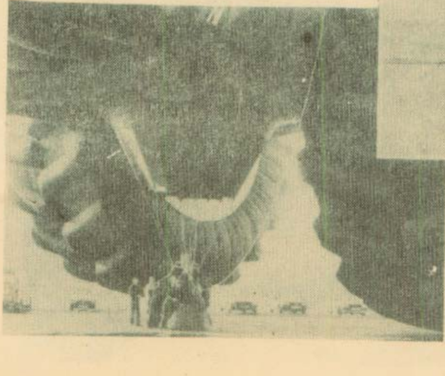

فربہ والدین

کہتے ہیں کہ زیادتی ہر چیز کی بُری ہوتی ہے۔ چاہے وہ کسی بھی شکل میں ہو۔ اب انہی میاں بیوی کو دیکھ لیجئے۔ ۳۳ سالہ گائی لیوس پیشے کے اعتبار سے اسکول بس ڈرائیور ہیں۔ ان کا وزن ۴۱۸ پونڈ ہے۔ ان کا قد پانچ فٹ آٹھ انچ ہے۔ ان کی کمر کا گھیراؤ ۶۸ انچ ہے ان کی بیگم مارشا کا وزن ۴۰۳ پونڈ ہے اور قد پانچ فٹ سات انچ ہے۔ گویا دونوں میاں بیوی کا مجموعی وزن ۸۲۱ پونڈ ہے۔ تصویر میں ان کا نوسالہ اکلوتا بیٹا جوشوآ نظر آرہا ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ والدین کے برعکس وہ انتہائی دُبلا پتلا ہے۔

دونوں میاں بیوی اپنے موٹاپے کے باعث سخت پریشان ہیں۔ کسی بھی ریسٹورینٹ میں وہ بیٹھ کر کھاپی نہیں سکتے۔ کیونکہ کرسیاں ان کا وزن برداشت کرنے سے قاصر ہوتی ہیں۔ اسی طرح وہ سلے سلائے کپڑے خریدنے کے بجائے درزی سے اپنے کپڑے سلوانے پر مجبور ہیں۔ تصویر میں نظر آنے والا صوفہ مسٹر گائی نے خود بنایا ہے۔ اس صوفے میں بھی جوشوآ کے لئے مشکل سے جگہ بن سکی ہے۔ دونوں کا کہنا ہے کہ انہوں نے ڈائیٹنگ کی ہر ممکن کوشش کر لی مگر جب وزن کسی بھی طرح کم نہ ہوا۔ تو انہوں نے اس بارے میں فکر کرنا چھوڑ دیا۔

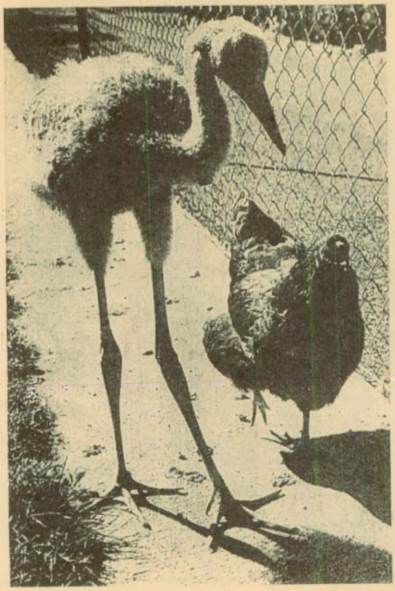

شتر مرغ اور

... امریکہ کے ایک چڑیا گھر میں شتر مرغ اپنی "رضاعی ماں" یعنی ایک اصیل مرغی کے ساتھ چہل قدمی کر رہا ہے۔ آپ کی حیرانی بجا ہے کہ کہاں چھ فٹ اونچا شتر مرغ اور کہاں ایک چھوٹی سی "مُرغی ماں"۔ بات یہ ہے کہ مرغی نے شتر مرغ کے ایک انڈے کو چار ہفتوں تک سیا۔ تب کہیں جا کر اس سے یہ شُتر مرغ برآمد ہوا۔ چڑیا گھر کے منتظمین کا کہنا ہے کہ دونوں "ماں بیٹوں" کی محبت دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ دونوں ہر وقت ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ نظر آتے ہیں۔

ایسی جلدی بھی کیا ہے

کھانا کھاتے ہوئے بے صبری کا مظاہرہ کبھی نہ کیجئے۔
شدید گرم کھانا منہ جلانے کے علاوہ معدے کی تکلیف کا باعث بھی ہو سکتا ہے۔ عجلت میں کھایا ہوا کھانا پیٹ کی تکالیف اور نظامِ ہضم میں خرابی کا باعث بن سکتا ہے۔

تحمل کے ساتھ
کھانے کی عادت
آپ کی صحت
کی ضامن ہے۔

(اشتہار ادارہ آنکھ مچولی)

حرفوں کا گورکھ دھندا

حرفوں کا گورکھ دھندا آپ کو پسند آیا. آپ کی ذہانت نے کئی خوبصورت جُملے تخلیق کئے اور اس کی داد پائی. ہم بھی آپ کی صلاحیتوں کے معترف ہو گئے.

اس بار بھی مقابلے میں شریک تو بہت سے ساتھی ہوئے مگر جُملے دیکھ کر اندازہ ہوا کہ یہ مقابلہ واقعی قدرے سخت تھا۔ خوبصورت اور زبان و بیان کے اعتبار سے اچھے جُملے بہت کم آئے۔ جبکہ بہت سے جُملے خوبصورت ہونے کے باوجود تکنیکی اعتبار سے کمزور تھے. اس لئے شاملِ اشاعت نہ ہو سکے. ہم اس دوسرے مقابلے کے ساتھ ہی حرفوں کے گورکھ دھندے کو یہیں ختم کرتے ہیں. ہمیں اپنے قارئین ساتھیوں سے یہ کہنا ہے کہ وہ اس طرز کے مقابلوں کو اپنے تئیں بھی جاری رکھیں... دوست مل کر کھیلیں اور ایک دوسرے کو چیلنج کریں. یہ مشغلہ یقیناً ان کی ذہانت، اظہار کی قُدرت اور بیان کی نُدرت بڑھائے گا. چند خوبصورت جملوں کو ہم یہاں آپ کے مطالعے کے لئے شائع کر رہے ہیں. اور ساتھ ہی کامیاب شرکاء کو کتب کا تحفہ روانہ کر رہے ہیں.

★ ★

یکساں طور پر پسند کئے جانے والے چھ خوبصورت جملے

۱۔ آپ کیا نہیں جانتے، بہترین عبادت خدمتِ خلق ہے۔

حور بانو ۔ خانیوال

۲۔ سچ بول ورنہ ہمیشہ ناکامی پیچھا کرتی رہے گی

جمیل عزیز ڈرگ کالونی، کراچی

۳۔ ہے سبز گنبد تسکینِ دوجہاں تکمیل محبت روح کی

عرفان زیل پاک کالونی، حیدر آباد

۴۔ ہے دُعا میری خُدایا ۔ لہرائے ہمیشہ پرچم وطن کا

محمد اسلم قریشی، حسن لشکری اسٹریٹ کراچی

۵۔ ہم کاش لڑنا بھڑنا چھوڑیں تعمیر کریں وطن کی

محمد عادل منہاج ۔ نیو کراچی

۶۔ اے خدا میری زندگی نچھاور ہو سکے تیرے دین پہ۔

آصف رضا ۔ واپڈا تھرمل اسٹیشن گڈو

سات خوبصورت مگر تکنیکی اعتبار سے قدرے کمزور جملے

۱۔ جب ملے خوشی حقیقی، شکرانہ ادا کر اپنے خدا کا۔

محمد فرقان ۔ پاکستان چوک کراچی

۲۔ ہے میرا مقصدِ زندگی گزاروں اطاعتِ رسول میں یہ۔

عظمیٰ ادریس، رامسوامی کراچی

۳۔ جو بھی ہمیں مذہبی سمجھائے باتیں اچھا لگے وہ۔

محمد جاوید ۔ ٹنڈو الہ یار

۴۔ اے خدا ہمیں انسان کامران بنا دے طاقت بخش دے۔

خالد عزیز، نارتھ ناظم آباد کراچی

۵۔ اے خدا نازل فرما دُ رحمتیں ہماری پاک زمین پہ

محمد فیصل ٹنڈو الہ یار

۶۔ ہے وقت ہیرا انمول، ناممکن کھو کر پانا اسے ہے۔

مقصود احمد ہیرا آباد ۔ حیدر آباد

۷۔ اے پاک اللہ ہماری اسلامی قدریں زندہ رکھ تو

منور رشید، سبزی منڈی روڈ ملتان

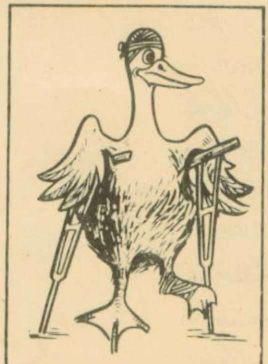

پرندوں کو نہ ماریئے

پرندے ہماری کائنات کا حُسن ہیں

پرندے نظامِ حیات کا جزوِ لازم ہیں

اِنھیں نہ ماریئے

انھیں ان کی فطری عمر تک جینے کا حق دیجیے

ادارہ آنکھ مچولی

صحت یا چٹخارہ —؟

نیّر ابدالی

آپ ان دونوں میں سے کسے زیادہ پسند کریں گے ؟

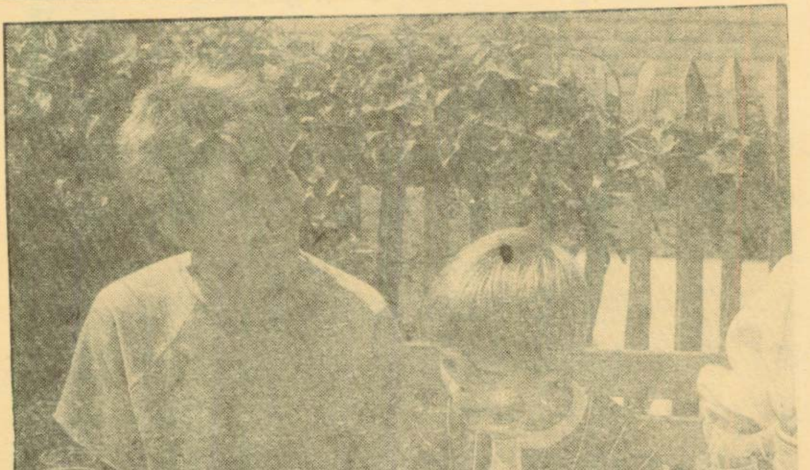

ہم دن میں تین مرتبہ کھانا کھاتے ہیں۔ یعنی صبح کا ناشتہ دوپہر کا کھانا اور رات کا کھانا۔ جبکہ سہ پہر میں چائے کے ساتھ ہلکا پھلکا ناشتہ بھی کیا جاتا ہے۔ کیا آپ نے کبھی سوچا کہ ہم جو غذا کھاتے

ہیں اُن میں کون سے اجزاُ شامل ہوتے ہیں اور ہم غذا کا استعمال کیوں کرتے ہیں ؟

ہماری غذا گوشت مچھلی، دُودھ انڈا، مکھّن، سبزی اور اناج پر مشتمل ہوتی ہے۔ ان میں جو اجزاُ پائے جاتے ہیں اُن کو ہم پروٹین، یعنی لحمیات، کاربوہائیڈریٹس یعنی نشاستہ، منرل یعنی معدنیات، فیٹس، یعنی چکنائی اور وٹامن یعنی حیاتین کہتے ہیں۔ ایک اچھی اور متوازن خوراک وہی ہوتی ہے جس میں یہ اجزاُ اپنے مخصوص تناسب کے ساتھ موجود ہوں۔ مثال کے طور پر پروٹین جسم کی نشوونما میں سب سے اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اور ہمارے جسم کے تمام پٹھے اور عضو اسی سے بنتے ہیں۔ اسی طرح جسم کی توانائی کے لئے... کاربوہائیڈریٹس اور معدنیات وغیرہ کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔

سمجھ دار لوگوں کا کہنا ہے کہ بہت زیادہ کھانا، بہت کم کھانا یا مضرِ صحت اشیأ کے کھانے سے انسان مختلف بیماریوں کا شکار ہوسکتا ہے اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ خوراک متوازن، صاف سُتھری اور مناسب ہونی چاہیئے۔ بات صرف اتنی سی نہیں ہے کہ ہم نے غذا استعمال کی اور فوراً طاقت حاصل ہوگئی۔ بلکہ متوازن غذا کا متواتر استعمال ہی جسم کو چاق وچوبند رکھنے میں معاون ثابت ہوتا ہے غذا جسم میں پہنچ کر کئی گھنٹوں تک ہاضمے کے عمل سے گزر کر جزوِ بدن بنتی ہے اور کسی ایندھن کی طرح جسم میں جل کر توانائی مہیّا کرتی ہے۔ اس توانائی کو ہم "کیلوری" کا نام دیتے ہیں۔ عورتوں کی نسبت مرد زیادہ کیلوری خرچ کرتے ہیں۔ اسی طرح بچپن سے لڑکپن کا دور ایسا ہوتا ہے جس میں جوان آدمی کی نسبت زیادہ کیلوری خرچ ہوتی ہے۔

جب ہم سورہے ہوتے ہیں تو فی گھنٹہ ۶۵ ، کیلوری خرچ کرتے ہیں۔ چونکہ نیند کی حالت میں سارا جسم پُرسکون ہوتا ہے اس لئے اتنی کم کیلوری خرچ ہوتی ہے۔ اسی طرح دفتر میں کام کرتے ہوئے۔ ڈرائیونگ کرتے ہوئے یا باورچی خانے میں کھانا پکاتے ہوئے ہمارا جسم ۱۰۰ ، کیلوری فی گھنٹہ کے اعتبار سے خرچ کرتا ہے۔ اسی طرح ہلکے پھلکے کھیل یا جوگنگ کرتے ہوئے انسانی جسم ۴۰۰ کیلوری خرچ کرتا ہے۔ اس کے مقابلے میں اگر کوئی کھلاڑی اسکواش کھیل رہا ہو یا تیراکی کررہا ہو یا تیز بھاگ رہا ہو تو اُس کے جسم کو ایک گھنٹے میں ۶۵۰ ، کیلوری خرچ کرنا پڑتی ہے۔

ہماری خوراک کا ایک اہم جزو حیاتین یعنی وٹامن بھی ہیں۔ یہ جسم میں مختلف کیمیائی عمل وردِ عمل پیدا کرتے ہیں۔ یہ جسم کی نشوونما میں بھی نمایاں کردار ادا کرتے ہیں۔ ہمیں روزمرّہ کی خوراک میں وٹامن کی بہت کم مقدار کی ضرورت ہوتی ہے مگر یہ تھوڑی سی مقدار بھی صحت وتندرستی کے لئے نہایت ضروری ہوتی ہیں۔ وٹامنوں کی چھ اقسام بیان کی جاتی ہیں۔

وٹامن اے مچھلی، سبزی، کلیجی، گاجر، پالک میں پایا جاتا ہے۔ یہ آنکھوں اور جلد کی نشوونما میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

وٹامن بی۔ اناج، پتوں والی سبزیوں، انڈا اور دودھ میں پایا جاتا ہے۔ یہ جسم کی نشوونما اور جلد کی تندرستی کا کام انجام دیتا ہے۔

وٹامن سی۔ سبزیوں، پھلوں خصوصاً مالٹا، کینو، لیموں، سیب، گاجر وغیرہ میں پایا جاتا ہے۔ جسم کے اندر لاتعداد سیلوں کے باہمی رابطے کا کام انجام دیتا ہے۔ اس کے حصول کے لئے لازمی ہے کہ پھل تازہ استعمال کئے جائیں۔

وٹامن ڈی۔ اس کے حصول کا سب سے بڑا ذریعہ سورج ہے۔ اس کے علاوہ یہ مچھلی، انڈا اور دودھ وغیرہ میں بھی پایا جاتا ہے یہ ہڈیوں کی تشکیل اور جلد کی خوبصورتی برقرار رکھنے کا کام انجام دیتا ہے۔

وٹامن ای۔ جسم کے سیل کی نشوونما میں اہم کردار ادا کرنے والا یہ جزو اناج اور سبز پتوں والی سبزیوں میں موجود ہوتا ہے۔ یہ وٹامن زخم بھرنے کی خصوصی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔

وٹامن کے۔ یہ خون کو جمانے کا انتہائی اہم کام سرانجام دیتا ہے۔ یعنی زخم لگنے کے بعد جسم میں موجود یہ وٹامن خون کو فوری طور پر زخم کے مقام پر گاڑھا اور منجمد کر دیتا ہے۔ اس طرح خون زیادہ مقدار میں بہنے سے محفوظ رہتا ہے یہ بھی سبزیوں میں پایا جاتا ہے۔

ہماری خوراک میں معدنیات کا بھی اہم حصہ ہوتا ہے۔ مثلاً دودھ سے کیلشیم سیب اور کھجور سے فولاد وغیرہ حاصل ہوتا ہے۔ ایک سب سے اہم معدن نمک ہے۔ اس کے بغیر کھانوں کی کوئی لذت پیدا نہیں ہو سکتی۔ نمک خوراک ہی کے لئے نہیں بلکہ صحت کے لئے بھی بہت ضروری ہے۔ غذائی ماہرین کا کہنا ہے کہ نمک کا ضرورت سے زیادہ استعمال ہائی بلڈ پریشر کا سبب بن سکتا ہے۔ اس لئے نمک کم سے کم استعمال کرنا چاہیئے۔

کھانے کے بعد اگر کھیر، پڈنگ یا کوئی میٹھی ڈش مل جائے تو کھانے کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے چینی کا استعمال جہاں کھانوں کی لذت یا ذائقے کے لئے کیا جاتا ہے وہاں یہ بھی جسم کی نشوونما میں بھی کارآمد ہوتا ہے۔ ویسے چینی کا زیادہ استعمال وزن کو بڑھانے کا سبب بھی ہوتا ہے اور اس سے دانت بھی جلدی خراب ہو جاتے ہیں۔ گنا اور چقندر چینی کے حصول کے بڑے ذرائع ہیں۔

عالمی ادارۂ صحت اور کئی نامور طبی ماہرین نے برسوں کی تحقیق کے بعد متوازن غذا کا ایک فارمولا وضع کیا

ہے ۔ جس پر عمل کر کے جہاں متوازن غذا حاصل کی جا سکتی ہے وہاں جسم کو مختلف امراض سے بھی بچایا جا سکتا ہے ۔ ان کا فارمولا بہت آسان ہے ۔

چکنائی   اپنی موجودہ خوراک سے تیل یا گھی کو ۲۵ ، فیصد کم کر دیجئے ۔ اسی طرح بناسپتی گھی کی مقدار کم کر کے نصف کر دیں ۔ اس طرح آپ دل کے امراض سے محفوظ رہیں گے ۔

شکر   اپنی خوراک میں شکر کا استعمال ۵۰ ، فیصد کم کر دیجئے ۔

نمک   اپنی خوراک میں نمک کا استعمال ۵۰ ، فیصد کم کر دیجئے ۔

ماہرین کا یہ بھی کہنا ہے کہ سبزیاں زیادہ بھوننے یا پکانے سے اپنے اجزاء کے بڑے حصے سے محروم ہو جاتی ہیں ۔ اس لئے محض زبان کے چٹخارے کے لئے سبزیوں کو دیر تک نہیں پکانا چاہئے ۔ بلکہ ان کو اُبلی ہوئی حالت میں کھانا چاہئے ۔ سب سے بڑھ کر یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ آپ جو کچھ بھی کھائیں اُسے صاف سُتھرا اور تازہ ہونا چاہئے ۔ اور کھانے کے بعد اللہ تعالیٰ کا شکر ضرور ادا کرنا چاہئے ۔ کہ اُس نے ہمیں بے شمار نعمتوں سے نوازا ۔

تم سونگھو سگریٹ کا دھواں ہم سونگھیں ہیں پھول

علم و ادب کے فروغ میں جو ادارے "آنکھ مچولی" سے تعاون کر رہے ہیں، ان کی تعداد بے شمار ہے۔ اس صفحے پر ہم صرف اُن بڑے ایجنٹس کی فہرست دے رہے ہیں، جن کی کوششوں سے ماہنامہ آنکھ مچولی پاکستان کے دُور دراز علاقوں تک بڑی تعداد میں پہنچتا ہے۔

آنکھ مچولی کے ایجنٹس

پاکستان بھر میں

محمد حسین برادرز۔ کراچی فون:۔ ۷۲۳۹۵۵	پاکستان اسٹینڈرڈ بک اسٹال۔ سرگودھا فون:۔ ۶۲۹۵۱
سلطان نیوز ایجنسی۔ لاہور فون:۔ ۵۸۲۴۹	کیپٹل نیوز ایجنسی۔ بہاولپور فون:۔ ۲۹۵۷
ملک تاج محمد صاحب۔ راولپنڈی فون:۔ ۵۵۴۳۲۱ / ۸۴۷۹۸۶	طاہر نیوز ایجنسی۔ جہلم فون:۔ ۵۹۴۱
مہران نیوز ایجنسی۔ حیدر آباد فون:۔ ۲۰۱۲۸	چوہدری امانت علی اینڈ سنز۔ رحیم یار خان فون:۔ ۲۶۲۶
افضل نیوز ایجنسی، چوک یادگار، پشاور فون:۔ ۶۲۵۱۵ / ۶۲۷۵۱	وہاڑی نیوز ایجنسی۔ ریل بازار وہاڑی
اے ایس حامد نیوز پیپر سروس، ملتان فون:۔ ۴۳۳۱۰ / ۴۱۷۵۷	اسلم نیوز ایجنسی۔ اخبار گھر۔ گوجرانوالہ
فیاض بُک ڈپو۔ فیصل آباد فون:۔ ۲۷۴۰۶	اشرف نیوز ایجنسی۔ بالمقابل جی ٹی ایس بس اسٹینڈ۔ اوکاڑہ
ایم ایم ٹریڈرز۔ کوئٹہ فون:۔ ۷۵۰۰۲	مسلم بُک ڈپو۔ سرائے عالمگیر
ملک اینڈ سنز۔ سیالکوٹ فون:۔ ۸۷۹۸۹	سلمان برادرز۔ نواب شاہ فون:۔ ۲۴۱۴
سعید بُک اسٹال۔ گجرات فون:۔ ۴۳۳۱	

رسالہ نہ پہنچنے کی صورت میں یا بروقت نہ ملنے پر مندرجہ ذیل پتے پر خط لکھئے

سرکولیشن مینیجر
"ماہنامہ آنکھ مچولی" ڈی ۱۲۳، نورس روڈ، سائٹ کراچی ۱۶

گنی چُنی معلومات

عقیل عباس جعفری

اعداد کا ہماری زندگی سے گہرا تعلق ہے۔ دُنیا کی اہم شخصیات ہوں یا بڑے بڑے واقعات، ان سب کا تعلق کسی نہ کسی طرح اعداد سے ضرور بنتا ہے۔ اعداد کے حوالے سے دُنیا بھر کی اہم معلومات پر مبنی یہ سلسلہ ہم ہر ماہ آپ کی دلچسپی اور معلومات میں اضافے کے لیے پیش کرتے ہیں۔ صفر سے شروع ہونے والا سلسلہ دیکھیے کہاں تک جاتا ہے۔

(۸۱)

- عرب الہند کے کھلاڑی کلائیو لائیڈ کو سب سے زیادہ ایک روزہ بین الاقوامی میچوں کی قیادت کرنے کا اعزاز حاصل ہے انھوں نے ۸۱ میچوں میں قیادت کی، جن میں ۶۱ جیتے ۱۸ ہارے اور دو ٹائی ہوئے
- دنیا میں ایک مربع میل میں اوسطاً ۸۱ افراد بستے ہیں۔
- زمین چاند سے ۸۱ گنا بھاری ہے۔
- شہادت کے وقت حضرت عثمانؓ کی عمر ۸۱ برس تھی۔
- برطانیہ کے دو حکمران ۸۱ برس کی عمر میں فوت ہوئے۔ یعنی جارج سوم اور ملکہ وکٹوریہ۔
- بھارتی سیاستدان مرارجی ڈیسائی مارچ ۱۹۷۷ء میں بھارت کے وزیرِ اعظم بنے۔ اس وقت ان کی عمر ۸۱ برس تھی۔ جو کسی وزیرِ اعظم کی تقرری کے وقت کا عالمی ریکارڈ ہے۔
- روس میں ۸۱ زبانیں بولی جاتی ہیں۔
- کرکٹ کی وکٹ ۸۱.۵ سینٹی میٹر (۲۸ اِنچ) اونچی ہوتی ہے۔
- گوئٹے نے جب اپنا معرکۃ الآرا ناول فاؤسٹ مکمل کیا تو ان کی عمر ۸۱ برس تھی۔
- دنیا کے جنوبی نصف کُرّے میں ۱۹٪ خشکی اور ۸۱٪ پانی ہے۔

(۸۲)

- قرآنِ پاک کی مکّی سورتوں کی تعداد ۸۲ ہے۔

- ایک روزہ بین الاقوامی میچوں میں تیز ترین سینچری بنانے کا اعزاز غرب الہند کے کھلاڑی کلائیو لائیڈ کا ہے، جنہوں نے پہلے عالمی کپ کے فائنل میں آسٹریلیا کے خلاف صرف ۸۲ گیندیں کھیل کر سینچری اسکور کی تھی۔
- دوسری عالمی جنگ کی آخری بڑی لڑائی یکم اپریل ۱۹۴۵ء کو بحرالکاہل کے جزیرے اوکی ناوا میں شروع ہوئی جس میں ۸۲ دن بعد امریکہ نے جاپان کو شکست دے دی تھی۔
- امریکی ادیب ارل اسٹینلے گارڈنر نے پیری میسن کے کردار پر مشتمل ۸۲ کتابیں تحریر کی تھیں۔
- اسپین کے مشہور مصور فرانسسکو گویا کا انتقال ۱۸۸۲ء میں ہوا۔ انتقال کے وقت اس کی عمر ۸۲ برس تھی۔
- انٹرنیشنل اولمپک کمیٹی کے ارکان کی تعداد ۸۲ رہی ہے۔
- ۱۹۵۲ء میں امریکی بحری جہاز "یونائیٹڈ اسٹیٹس" نے ۳۳٫۵ ناٹ کی رفتار سے ۸۲ گھنٹے میں بحر اوقیانوس عبور کیا تھا۔
- پاکستان کے قومی ترانے کے خالق حفیظ جالندھری کا انتقال ۲۱ دسمبر ۱۹۸۲ء کو ہوا۔ اس وقت ان کی عمر ۸۲ سال تھی۔

(۸۳)

- دنیا کی ۶٫۸۳٪ آبادی شہروں میں رہتی ہے۔
- دنیا کے پہلے خلائی جہاز اسپتنک اول کا وزن ۸۳٫۶ کلوگرام تھا۔
- دنیا کی پہلی رنگین کارٹون فلم والٹ ڈزنی کی "سنو وہائٹ اور سات بونے" تھی۔ جو ۸۳ منٹ کے دورانیہ پر مشتمل تھی۔
- انسانی خون میں ۸۳٪ پانی ہوتا ہے۔
- دنیا کے سب سے بڑے بحری جہاز کوئن الزبتھ کا وزن ۸۳ ہزار ۶۷۳ ٹن تھا۔
- انسانی جسم کے ۵۲۷ عضلات میں سے ۸۳ عضلات' سر اور چہرے میں واقع ہوتے ہیں۔
- ۱۹۸۱ء میں برطانیہ میں ۸۳ ہزار افراد دکانوں سے چھوٹی موٹی چوریاں کرتے ہوئے پکڑے گئے تھے۔
- ۲۲ نومبر ۱۹۸۰ء کو مس شیلا چشہوم نے ایک انجن والے سیسنا طیارے پر برطانیہ سے آسٹریلیا تک کا فاصلہ ۸۳ گھنٹے میں تنہا طے کرکے عالمی ریکارڈ قائم کیا تھا۔
- روس کے یوری گگارین خلا میں بھیجے جانے والے پہلے شخص تھے۔ انہوں نے یہ کارنامہ ۱۲ اپریل ۱۹۶۱ء کو انجام دیا۔ وہ اس کارنامے کے ۸۳ ماہ بعد مارچ ۱۹۶۸ء میں ایک ہوائی حادثے میں ہلاک ہوئے۔

(۸۴)

- سکھر میں واقع میر معصوم شاہ بھکری کے مینار کی بلندی بھی ۸۴ ، فٹ ہے اور اس میں سیڑھیوں کی تعداد بھی ۸۴ ہے۔
- بجلی کے بلب کے موجد ٹامس ایلوا ایڈیسن نے اکتوبر ۱۹۳۱ء میں وفات پائی۔ انتقال کے وقت اس کی عمر ۸۴ برس تھی۔
- یورنیس سورج کے گرد ایک چکر ۸۴ ، سال میں مکمل کرتا ہے۔
- ہر ۸۴ ، ولادتوں میں سے ایک جڑواں بچوں کی ہوتی ہے۔
- دنیا کا ذہین ترین شخص "سر آئزک نیوٹن کو کہا جاتا ہے۔ جب ۱۷۲۷ء میں ان کا انتقال ہو تو ان کی عمر ۸۴ ، برس تھی۔
- روسی فضائی کمپنی ایروفلوٹ کا دائرہ کار ۸۴ ، ممالک تک پھیلا ہوا ہے۔
- برطانیہ کی آبادی کے ۷٪ افراد، وہاں کی ۸۴٪ دولت کے مالک ہیں۔

(۸۵)

- باسکٹ بال کا کورٹ ۸۵ ، فٹ اور ۴۶ ، فٹ چوڑا ہوتا ہے۔
- گندم کے دانے میں آٹے کا تناسب ۸۵٪ ہوتا ہے۔
- الجزائر کے ۸۵٪ رقبے پر صحرائے صحارا محیط ہے۔
- اسرائیل کی ۸۵٪ آبادی یہودی اور بھارت کی ۸۵٪ آبادی ہندو ہے۔
- سنگاپور نے جاپان کے سامنے ۱۹۴۲ء میں ہتھیار ڈالے۔ جس کے نتیجے میں ۸۵ ، ہزار انگریز جنگی قیدی بنے تھے۔
- بین الاقوامی زبان ایسپرانٹو کے ارکان دنیا کے ۸۵ ، ممالک میں موجود ہیں۔
- سیب میں ۸۵٪ پانی ہوتا ہے۔
- کہا جاتا ہے کہ اگر انکل ٹومز کیبن نہ لکھی جاتی تو ابراہام لنکن امریکہ کا صدر نہ بنتا۔ اس کتاب کی مصنفہ مسز ہیرٹ بیچر اسٹو کا انتقال ۱۸۹۶ء میں ہوا۔ اس وقت ان کی عمر ۸۵ ، سال تھی۔
- بجلی کے بلب میں بجلی کا صرف ۱۵٪ حصہ اُسے روشن کرنے کے کام آتا ہے۔ بقیہ ۸۵٪ حصہ حرارت کی شکل میں ضائع ہو جاتا ہے۔
- پاکستان کے مایۂ ناز وکٹ کیپر وسیم باری کا سب سے بڑا انفرادی اسکور ۸۵ ، رنز ہے۔ جو انہوں نے ۷۹-۱۹۷۸ء میں نائٹ واچ مین کی حیثیت سے کھیلتے ہوئے بھارت کے خلاف بنایا تھا۔

(۸۶)

- ۲۴ گھنٹے میں ۸۶،۴۰۰ سیکنڈ ہوتے ہیں۔
- امریکہ کا سب سے نچلا مقام کیلیفورنیا کی وادیٔ موت ہے جو سطحِ سمندر سے ۸۶ میٹر (۲۸۲ فٹ) نیچے ہے۔ اس مقام کا درجۂ حرارت ۶۰ درجے سینٹی گریڈ (۱۴۰ درجے فارن ہائیٹ) ہے۔
- مشہور مؤرخ ٹوائن بی کا انتقال ۱۹۷۵ء میں ۸۶ برس کی عمر میں ہوا۔
- ۱۰۲ منزلہ ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ اصل نقشے کے مطابق ۸۶ منزلہ (۱۱۰۰ فٹ) بلند بنا تھی۔ اوپر کی ۱۶ منزلیں بعد کا اضافہ ہیں۔
- اگست ۱۹۸۱ء میں آسٹریلیا کے خلاف کھیلتے ہوئے انگلستان کے آئن بوتھم نے صرف ۸۶ گیندوں پر سینچری اسکور کی تھی۔

(۸۷)

- ۱۹۶۹ء میں دنیا بھر میں جہازوں کے اغوا کی ۸۷ وارداتیں ہوئی تھیں۔ جن میں سے ۴۰ وارداتیں صرف امریکہ میں پیش آئی تھیں۔
- گائے کے خالص دودھ میں ۸۷ فیصد پانی ہوتا ہے۔
- اگاتھا کرسٹی نے ۸۷ جاسوسی ناول تحریر کیے تھے۔
- جس سفر میں کولمبس نے امریکہ دریافت کیا۔ اس سفر میں اُس کے ہمراہ ۸۷ افراد تھے۔
- امریکہ کے سر فرانسس پیٹن راؤس نے ۸۷ برس کی عمر میں ۱۹۶۶ء میں طب کا نوبل انعام حاصل کیا۔ وہ نوبل انعام حاصل کرنے والے دنیا کے معمر ترین شخص ہیں۔
- اسنوکر اور بلیئرڈ کی میز زمین سے ۸۷ سینٹی میٹر اونچی ہوتی ہے۔
- آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کا انتقال ۸۷ برس کی عمر میں جلاوطنی کے عالم میں رنگون میں ہوا۔
- سان فرانسسکو کے مشہور گولڈن گیٹ برج کی تعمیر میں ۸۷ ہزار میل تار استعمال ہوا تھا۔
- ٹیسٹ کرکٹ میں ایک اننگز میں سب سے زیادہ رنز دینے کا عالمی ریکارڈ آسٹریلیا کے فلیٹ ووڈ اسمتھ کا ہے جنہوں نے ۱۹۳۸ء میں انگلستان کے خلاف ۸۷ اوورز پھینکے۔ جن میں سے گیارہ میڈن رہے اور انہوں نے ۲۹۸ رنز دے کر صرف ایک وکٹ حاصل کی۔

ایک ضروری بات

ادارہ آنکھ مچولی نے بارہا اپنے لکھنے والوں سے درخواست کی ہے کہ وہ نقل شدہ تحریروں کے بجائے ہمیں اپنی ذاتی تحریریں بھجوائیں۔ خواہ وہ کتنی ہی کمزور کیوں نہ ہوں، لیکن بار بار کی یاد دہانیوں کے باوجود بھی بعض ساتھی ہمیں دوسروں کی تحریریں اپنے نام سے بھجوا دیتے ہیں۔ ایسا کرنا بد دیانتی بھی ہے اور تکلیف دہ عمل بھی۔ نقل شدہ تحریریں بھجوانے کے اس منفی رجحان کو روکنے کے لیے ہم اپنے قارئین ساتھیوں کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ تمام تحریریں بغور پڑھیں اور اگر چوری کی ہوئی یا نقل شدہ کوئی تحریر دیکھیں تو براہِ کرم فوراً اس کی نشاندہی کریں۔ چوری کی تحریریں بھجوانے والوں کے لیے ہمیں مجبوراً "بلیک بکس" کا ایک سلسلہ شروع کرنا پڑ رہا ہے۔ یہ گویا ایک چھوٹی سی سزا ہے۔ جو ساتھی بھی ہمیں نقل شدہ تحریر بھجوائے گا ہم اُس کا نام اور پتہ "بلیک بکس" میں شائع کیا کریں گے۔ نہ صرف یہ بلکہ "آنکھ مچولی" میں آئندہ ان کے نام سے کبھی کوئی تحریر شائع نہ ہو سکے گی۔ (بلیک بکس "ننھی نگارشات" کے آخری صفحے پر دیکھیے)

وقت

ہمایوں مجاہد۔ کھیوڑہ

یہی حالات کو معمول پہ لانے والا
یہی سوئے ہوئے انساں کو جگانے والا
یہی جاگے ہوئے انسان کو سُلانے والا

وقت اک زخم بھی ہے وقت مسیحا بھی ہے
وقت اپنا بھی ہے اور وقت پرایا بھی ہے
وقت اک ٹوٹے ہوئے دل کا سہارا بھی ہے
گود سے قبر تلک وقت ہی لے جائے گا
غم یہی دے گا، یہی خوشیوں سے نہلائے گا
وقت کو کھوئے گا جو، کچھ بھی نہیں پائے گا

غلط فہمی

صبا سلیم، نارتھ ناظم آباد کراچی

حمیرہ اور رفیعہ ایک ہی کلاس میں پڑھتی تھیں۔ اگرچہ اُن کا محلہ بھی ایک ہی تھا مگر اُن کے معیارِ زندگی میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ حمیرہ کے ابّو کسی سرکاری محکمے میں ہیڈ کلرک تھے۔ جبکہ رفیعہ کے والد کسٹم میں کسی بڑے عہدے پر فائز تھے۔

حمیرہ بہت ذہین اور سنجیدہ لڑکی تھی۔ وہ ہمیشہ کلاس میں فرسٹ آتی اس کے علاوہ اُسے دنیا بھر کے بارے میں بے شمار باتیں معلوم تھیں جنہیں وہ گردن ہلاہلا کر اور ہاتھ گھما گھما کر بیان کرتی تو ساری لڑکیاں دیکھتی رہ جاتیں۔ حمیرہ کی ذہانت اور معلومات سے اُس کی اُستانیاں بھی بہت مرعوب رہتیں۔ رفیعہ حمیرہ سے بہت متاثر تھی۔ اُس کی خواہش تھی کہ وہ بھی حمیرہ کی طرح بن سکے۔ حمیرہ اگرچہ اچھی لڑکی تھی۔ مگر پڑھنے میں وہ کوئی خاص نہ تھی۔ بس ہر سال پاس ہو جاتی تھی۔

حمیرہ اور رفیعہ کی ایک کلاس فیلو تھی۔ نام تھا اُس کا فرحت۔ کہتے ہیں نام کا انسان کی شخصیت پر بڑا اثر ہوتا ہے مگر فرحت اپنے نام کے بالکل برعکس تھی۔ جہاں بیٹھتی فساد پھیلا دیتی۔ لوگوں کو لڑوا کر اُسے بے حد مزا آتا تھا۔ پڑھنے لکھنے سے بھی فرحت کو دلچسپی نہ تھی۔ فرحت کو حمیرہ اور رفیعہ کی دوستی ایک آنکھ نہ بھاتی۔ وہ ان دونوں کی دوستی کو "مخمل کے قالین میں ٹاٹ کا پیوند" کہتی۔ اُس کی خواہش تھی کہ وہ اُن دونوں کو لڑوا کر رفیعہ سے دوستی کر لے۔ تاکہ اُس کے قیمتی ساز و سامان کو استعمال کر سکے اور حمیرہ کے ساتھ اُس کی کار میں گھر سے اسکول اور اسکول سے گھر آجا سکے۔ اور یوں اپنی محلے داروں پر امیر لڑکی کے ساتھ دوستی کا رعب گانٹھ سکے۔

ان تینوں کے سالانہ امتحان قریب تھے۔ رفیعہ نے حمیرہ سے اُس کے نوٹس مانگے۔ رفیعہ ہمیشہ حمیرہ کے نوٹس پڑھ کر امتحان کی تیاری کرتی تھی۔ اتفاق کی بات کہ جس دن رفیعہ نے حمیرہ سے نوٹس مانگے اُس سے ایک روز قبل رات کو بارش ہوئی تھی۔ جس میں حمیرہ کا پورا بستہ بھیگ گیا تھا۔ ظاہر ہے اُس کے نوٹس بھی بھیگ کر خراب ہو گئے تھے۔ حمیرہ نے رفیعہ کو نوٹس کے بھیگنے کے بارے میں بتایا۔ رفیعہ کو یقین آگیا۔ فرحت نے یہ سُنا تو اُسے ایک نادر موقع ہاتھ آگیا۔

اس نے رفیعہ کے خوب کان بھرے۔ اُس نے کہا "بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اُس کے سارے نوٹس بھیگ گئے ہوں، میری مانو وہ نہیں چاہتی کہ تمہارے نمبر اچھے آئیں"۔ اور نہ جانے اُس نے کیا کیا کہا۔ اتفاق کی بات کہ اُسی روز حمیرہ کا قیمتی جاپانی جیومیٹری بکس گم ہو گیا۔ نتیجتاً مس نے پوری کلاس کی تلاشی لی۔ جیومیٹری بکس حمیرہ کے بستے سے برآمد ہوا تو پوری کلاس میں کھسر پسر ہونے لگی۔ حمیرہ شرمندگی کے مارے سفید ہو گئی۔

حمیرہ نے مس کو قسمیں کھا کر یقین دلایا کہ اُس نے جیومیٹری بکس نہیں لیا۔ چونکہ حمیرہ کا کردار مس کے سامنے تھا اس لئے مس کو یقین کرنا ہی پڑا۔ اس واقعہ کے فوراً بعد فرحت نے رفیعہ کے خوب کان بھرے اور اُسے یقین دلا دیا کہ حمیرہ کا کردار کچھ مشکوک ہو گیا ہے۔ نیز یہ کہ حمیرہ کی رفیعہ سے صرف اس لئے دوستی ہے کہ رفیعہ بہت امیر ہے۔ اگرچہ رفیعہ نے اس واقعہ پر بھی حمیرہ کو کچھ نہ کہا لیکن اُس کے دل میں حمیرہ کے لئے شک بیٹھ گیا تھا۔ یہ شک چھوٹی چھوٹی اور ناقابلِ ذکر باتوں سے کینسر کی طرح پھیلتا گیا۔ اور حمیرہ سے رفیعہ کی دوستی کم سے کم ہوتی گئی۔ فرحت نے اس صورتِ حال سے پورا فائدہ اُٹھایا۔ اور اُس نے رفیعہ سے دوستی کر لی۔ دونوں ہر وقت ساتھ ہوتے۔ فرحت رفیعہ کی گاڑی میں بیٹھ کر اسکول آتی جاتی۔ اس کی ساری قیمتی چیزیں استعمال کرتی۔ یہاں تک کہ اُس کی پاکٹ منی پر بھی ہاتھ صاف کرتی۔ وقت یونہی گزرتا رہا۔

ایک دن کیا ہوا کہ رفیعہ کے ابو رشوت کے الزام میں گرفتار ہو گئے۔ اُن کے مقدمے نے طول کھینچا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ان کا گھر تک نیلام ہوگیا۔ رفیعہ دیکھتے ہی دیکھتے کار سے زمین پر آگئی۔ اُس کے ابو کو دس برس قید کی سزا ہوئی۔ اب وہ لوگ دوسرے محلے میں ایک معمولی سے گھر میں رہنے لگے تھے۔

رفیعہ کے حالات کیا بدلے فرحت کے تیور بھی بدل گئے۔ اب وہ فرحت سے دُور دُور رہنے کی کوشش کرتی۔ رفیعہ یہ دیکھتی تو چھپ چھپ کر پھوٹ پھوٹ کر روتی۔

حمیرہ کو یہ سب معلوم ہوا تو اُسے بڑا دکھ ہوا۔ اُس نے چاہا بھی کہ وہ رفیعہ کے پاس جاکر خود اُس سے بات کرے مگر اُس کی ہمت نہ پڑتی۔ چاہتی تو رفیعہ بھی یہی تھی کہ وہ خود حمیرہ سے بات کرے مگر اُس کی انا اُس کے آڑے آجاتی۔ آخر اُس نے حمیرہ سے خود ہی دوستی ختم کی تھی پھر بھلا وہ خود کیسے بات کرتی۔ جب سے رفیعہ کے ابو جیل گئے تھے۔ رفیعہ خاموش خاموش رہنے لگی تھی۔ اس کے علاوہ اُس میں ایک اور نمایاں تبدیلی آگئی تھی۔ وہ یکایک بہت ذہین ہوگئی تھی۔ چنانچہ اس سال کے امتحان میں حمیرہ کے بجائے رفیعہ کی فرسٹ پوزیشن آئی۔

مس جیسے ہی رزلٹ سُنانے کے بعد باہر گئیں۔ حمیرہ بے ساختہ اُٹھی اور جاکر رفیعہ سے لپٹ گئی۔ رفیعہ اس اچانک تبدیلی کے لئے تیار نہ تھی۔ اس لئے گھبرا گئی۔ اور اُس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کرے۔ مگر پھر تھوڑی ہی دیر بعد حمیرہ نے جب رفیعہ کے کان میں دھیرے سے کہا "مبارک ہو" تو رفیعہ نے نظریں جاکر حمیرہ کے چہرے کو دیکھا۔ رفیعہ کو پہلی ہی نظر میں حمیرہ کے چہرے پر ایسی خوشی نظر آئی جو صرف اُسی شخص کے چہرے پر نظر آتی ہے جو آپ کی کسی کامیابی پر واقعتاً خوش ہو۔ اس کے بعد دونوں نے ایک دوسرے سے کچھ نہیں کہا۔ ان دونوں کے ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پیوست ہوکر ہر غلط فہمی کا منہ چڑا رہی تھیں ...

چور اور چوری

روبینہ شمسہ۔ ڈرگ روڈ کراچی

چور اور چوری ازل سے لازم و ملزوم رہے ہیں بلکہ چور کی نسبت چوری کی زیادہ ہی اہمیت ہے کیونکہ چوری چور کی زندگی کا وہ بنیادی عنصر ہے جو کہ اُسے معاشرے میں اعلیٰ مقام حاصل کرنے کے لیے ٹھوس بنیاد فراہم کرتی ہے۔ تمام چور چوری کرنے کے لیے مختلف محیر العقول اقسام کے تجربات آزماتے ہیں۔

ایک قسم کے چور وہ ہیں جو چوری کے لیے کسی ایسے گھر کا انتخاب کرتے ہیں۔ جس کے اہلِ خانہ کم ہوں اور دولت زیادہ ہو۔ یہ چور صرف گھریلو قسم کی قیمتی اشیاء، نقدی اور کچھ ہلکے پھلکے زیورات کو پاکر خوشی سے پھول جاتے ہیں۔ ان چوروں کو ہم آزاد چور کہتے ہیں۔ کیونکہ یہ گروہ کی صورت میں نہیں ہوتے۔

دوسری قسم کے چور اعلیٰ گھرانوں کے وہ چشم و چراغ ہیں جو صراطِ مستقیم سے بھٹک جاتے ہیں۔ اور پھر "دادا ٹائپ" چوروں سے چوری اور ڈاکہ زنی کی تربیت حاصل کرتے ہیں۔ اس کے بعد سیٹھ لوگوں کے محل نما بنگلوں میں اپنی ماسٹر کیز Master Keys اور سائنسی آلات لے کر جاتے ہیں اور بھری تجوریاں خالی کرکے چوری کا سامان آپس میں بانٹ لیتے ہیں۔

تیسری قسم کے چور وہ طلبہ ہیں جو عملی زندگی سے دُور خوابوں کے جزیروں میں کھوئے رہتے ہیں۔ وہ ان خوابوں کی جلد تعبیر کے حصول کی خاطر منفی اقدامات کرنے سے بھی نہیں ہچکچاتے۔ ان اقدامات میں لڑکیوں کے پرس چرانا اور کاریں یا موٹر سائیکل وغیرہ چوری کرکے سیر سپاٹے کرنا شامل ہیں۔

ایک قسم کی چوری وہ بھی ہے جسے نتیجہ چوری کہا جاسکتا ہے۔ اس قسم کی چوری میں معاشرے کے اہم افراد ملوث ہیں۔ ایک تو وہ معزز اساتذہ جو کہ درس و تدریس جیسے مقدس اور باعزت پیشے کو اپنائے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ نالائق طلبہ کے سرمایہ دار سرپرست سے رشوت کا نذرانہ لے کر نالائقوں کی بھلائی اور باصلاحیت طلبہ کی تباہی کا سامان کرتے ہیں۔ دوسرے نتیجہ چور انتخابات کے نتائج مرتب کرتے وقت دھاندلی کرتے ہیں۔ ان کے اس عمل سے پورا ملک داؤ پہ لگ جاتا ہے۔

یہ تو خیر بڑوں کی چوری کا ذکر تھا لیکن آج کل تو ملک کا بچہ بچہ چوری کی بیماری میں مُبتلا ہے۔ پانچ یا چھ سالہ معصوم بچے چوری میں اس قدر اُستاد ہوتے ہیں کہ خدا کی پناہ، اس کمال سے اپنے ساتھیوں کی چھوٹی چھوٹی چیزیں چُراتے ہیں کہ اساتذہ بھی ان کی چوری پکڑنے میں ناکام ہو جاتے ہیں دوسری طرف جس بچے کی چیز چوری ہوتی ہے اس سے پوچھو کہ پنسل کہاں ہے؟ پتا نہیں ربر کہاں ہے؟ پتا نہیں کاپی کس نے لی؟ پتا نہیں۔ اب بتائیے بچے ہی ایسے ہیں تو بڑے تو خیر بڑے ہی ہیں نا۔

ایک اور قسم ایسے چوروں کی بھی ہے جو کہ بہترین مصنفوں، شاعروں اور ادیبوں کی خوبصورت تحریریں اور عمدہ اشعار مختلف قسم کے رسالوں میں شائع کرواکر مصنوعی فخر محسوس کرتے ہیں۔ ان تحریر چوروں میں زیادہ تر کمسن اور کم عمر طلبا ہی شامل ہیں

آپ نے یہ بھی دیکھا ہو گا کہ چوری کی بیماری گھر اسکول، بینکوں، قومی اور نجی اداروں اور شاہراہوں پر خاموشی کے ساتھ بہترین منصوبہ بندی سے ہو رہی ہے۔ جو اس بات کا ثبوت ہے کہ ہماری قوم غیر معمولی طور پر ذہین واقع ہوئی ہے مسجد ہماری معاشی اور مذہبی زندگی کا اہم اور مقدس ادارہ ہے جسے خدا کے گھر کی حیثیت حاصل ہے وہ بھی چوروں کی لعنت سے پاک نہ رہ سکی۔ کیا آپ نے جوتیوں کے چوروں کے متعلق سوچا ہے؟ صاحب صورتِ حال یہ ہو گئی ہے کہ روزانہ ہزاروں معزز افراد کو اپنی جوتیوں سے ہاتھ دھونا پڑتے ہیں۔ عید بقر عید کے موقعے پر تو یہ صورتِ حال اور بھی بگڑ جاتی ہے۔ جوتی چور کوئی اور لوگ نہیں ہوتے۔ وہ بھی معزز لوگ ہیں جو کہ مسجد میں نماز کے لیے آتے ہیں۔ وہ یہ چوری یا تو غلط فہمی میں کر جاتے ہیں یا پھر ذاتی مفاد کی خاطر جان بُوجھ کر ایسا کرتے ہیں۔ بہرحال ان چوروں کے ساتھ کوئی بازپُرس نہیں کی جاسکتی کیونکہ یہ خفیہ ہی رہ جاتے ہیں۔

●

علامہ اقبالؒ

عاصم الدین بفر زون، کراچی

مصورِ پاکستان، شاعرِ مشرق علامہ اقبالؒ نے اپنی شاعری کے ذریعے ملّتِ اسلامیہ کی جو خدمت کی ہے۔ وہ تاقیامت بھلائی نہ جا سکے گی۔

علامہ اقبالؒ نے قیامِ پاکستان کے لیے، مسلمانانِ ہند میں یہ احساس بیدار کیا کہ مسلمانوں کی ایک ایسی مملکت ہونی چاہیے جس میں مسلمان آزادی سے اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہو سکیں۔

۱۹۳۰ء میں الٰہ آباد کے مقام پر آپ نے خطبہ پڑھا جس میں برِصغیر کے مسلمانوں کے لیے ایک الگ وطن کا مطالبہ کیا گیا۔ کیونکہ وہ دیکھ چکے تھے کہ متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں کا مستقبل محفوظ نہیں۔

یہ خطبہ قیامِ پاکستان کی راہ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ قیامِ پاکستان کی خدمات میں جہاں بانیٔ پاکستان قائدِاعظمؒ کا نام آئے گا وہاں علامہ اقبالؒ کا نام بھی ضرور لیا جائے گا۔

علامہ اقبالؒ کی شخصیت کئی پہلوؤں سے شہرت کی حامل ہے کیوں کہ آپ شاعر کے علاوہ فلسفی، ماہرِ قانون اور ممتاز سیاستدان بھی تھے، لیکن آپ کو جو شہرت شاعری میں ملی وہ کسی اور شعبے میں نصیب نہ ہو سکی بلکہ ایشیا کے کسی بھی شاعر کو ایسی شہرت نصیب نہ ہو سکی۔ جو اقبالؒ کو ملی۔ اقبالؒ کی شہرت کا آغاز انجمن حمایتِ اسلام لاہور کے سالانہ جلسے سے ہُوا۔ آپ نے اس جلسے کے لیے یتیم بچوں کے فنڈ کے لیے ایک نظم "نالۂ یتیم" لکھی اور خود ہی پڑھی۔ اس نظم میں ایسا اثر انگیز درد تھا کہ جب آپ نے یہ نظم ترنّم کے ساتھ پڑھی تو سُننے والوں کے دل پر اثر کر گئی۔ جلسے کے اختتام پر آپ کو جو داد ملی۔ دراصل یہ ہی آپ کی شہرت

روشنی روشنی

مرسلہ: محمد عمران احمد کراچی

دل کو جب مل گئی علم کی روشنی
زندگی ہو گئی روشنی روشنی
اچھے اچھے خیالوں میں رہتے ہیں ہم
علم ہی کے اجالوں میں رہتے ہیں ہم
جب کتابیں کھلیں ہو گئی روشنی
راہ میں جگمگاتے دیئے کی طرح
سیدھا راستہ دکھاتے دیئے کی طرح
اچھے لوگوں کی ہے بات بھی روشنی
دوستوں سے ہمیشہ محبت رہے
ساتھیوں کے لیے دل میں چاہت رہے
پیار کی روشنی ہے بڑی روشنی

کی بنیاد ہے۔ اس کے بعد ہزاروں لوگ آپ کے گرویدہ ہو گئے۔ اس کے بعد ہر سال انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ جلسوں میں آپ نظمیں پڑھتے۔ جنہوں نے ملّتِ اسلامیہ کے خوابیدہ ذہنوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

علامہ اقبالؒ سچے عاشقِ رسولؐ تھے۔ جب بھی ذکرِ رسولؐ آتا۔ آپ کی آنکھیں اشکبار ہو جاتی تھیں۔ جب غازی علم الدین شہید کا مقدمہ پیش ہُوا تو بعض لوگوں نے کوشش کی کہ وہ اپنے ابتدائی بیان میں تبدیلی کر دے اس طرح اُن کی رہائی ممکن تھی۔ چنانچہ وُکلاء علامہ اقبالؒ کے پاس پہنچے اور اپنی تجویز پیش کی تو اقبالؒ بولے

"کیا غازی علم الدین اپنے مسلک سے ہٹ گیا ہے۔" انھوں نے جواب دیا۔

"نہیں وہ اپنے مسلک پر مضبوطی سے قائم ہے"

اس پر اقبالؒ نے کہا کہ

"پھر آپ کون ہوتے ہیں جو اس عاشقِ رسولؐ کو شہادت کا درجہ حاصل کرنے کے بیان سے ہٹانا چاہتے ہیں ..."

اقبالؒ کی سیرت اور زندگی کا سب سے قابلِ قدر جذبہ "عشقِ رسولؐ" ہے۔ احترامِ رسولؐ کا یہ عالم تھا کہ زندگی کے آخری ایام میں آپ اکثر اس خیال سے پریشان رہتے تھے کہ کہیں آپ کی عمر نبی کریمؐ سے زیادہ نہ ہو جائے۔ اللہ کی شان دیکھیے۔ آپ کی عمر نبی کریمؐ سے زیادہ نہ ہوئی۔ یعنی انتقال کے وقت آپ کی عمر ۶۱ برس تھی۔ جبکہ نبی کریمؐ کی عمر مبارک ۶۳ برس تھی۔

اقبالؒ کے دل میں خوفِ خدا، بچپن سے ہی تھا۔ اس ضمن میں ایک واقعہ مشہور ہے: بچپن میں اقبالؒ نے پہلا روزہ رکھا تو دوپہر کے وقت پیاس کی وجہ سے حالت بگڑنے لگی۔ تو اُن کے نانا ان کو کمرے میں لے گئے اور شربت کا گلاس دے کر بولے۔

"اقبال لو یہ پی لو کوئی نہیں دیکھ رہا" اقبالؒ نے شربت پینے سے انکار کر دیا اور بولے

"نانا ابو! میں نے جس کے لیے روزہ رکھا ہے وہ تو دیکھ رہا ہے نا"

استاد کا رُتبہ بہت بلند ہے، کیونکہ وہ ہمیں آنکھیں (علم) عطا کرتا ہے۔ وہ ہمیں دُنیا میں رہنے کے اصول سے روشناس کراتا ہے۔ جو بھی اُستاد کی عزت کرتا ہے یقین جانیے وہ ہی دُنیا میں عزت پاتا ہے۔

اقبالؒ بھی اپنے اُستاد کی بہت عزت کرتے تھے پروفیسر آرنلڈ اقبالؒ کے اساتذہ میں سے ایک ہیں۔ آپ کو اُن سے بڑی محبت تھی۔ پروفیسر صاحب بھی اقبالؒ کی عزت کرتے تھے۔ اس رشتے کی دونوں ہی قدر کرتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی نے پروفیسر صاحب سے پوچھا۔

"اقبال بحیثیت طالبِ علم کیسے تھے؟ پروفیسر صاحب نے جواب دیا۔

"میں نے اقبالؒ سے بہت کچھ سیکھا ہے" پروفیسر صاحب کی وفات پر آپ نے اپنی نظم "آرنلڈ کی یاد میں" لکھی ...

آج کا نوجوان اگر فلمی اداکاروں کا چیلا بننے کے بجائے اقبالؒ کے پیغام پر کان دھرے تو کوئی وجہ

نہیں کہ ہم ایک بار پھر دُنیا کی قوموں میں ایک نمایاں قوم کے طور پر نہ اُبھر سکیں۔

ہر چند کہ آج اقبالؒ ہم میں موجود نہیں ہیں، لیکن اُن کا قیمتی سرمایہ شاعری کی صورت میں آج بھی تروتازہ ہے۔ یہ بیش بہا سرمایہ جو عزم اور جواں مردی کا جذبہ پیدا کر دیتا ہے۔ زندگی گزارنے کا ڈھنگ سکھاتا ہے اسلامی تعلیمات کا پابند بنا دیتا ہے۔ کیونکہ آپ کا کلام قرآن مجید سے اثر لیے ہوئے ہے۔ آپ کا کلام خدائے بزرگ و برتر کی واحدنیت کا مکمل یقین دلاتا ہے۔ ختمِ نبوتؐ پر یقین رکھنے پر زور دیتا ہے۔ مسلمانانِ ارض کو بھائی بھائی بنا دینے کا گُر سکھا دیتا ہے۔

بُتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی، نہ ایرانی، نہ افغانی

ہماری عینک

تحریر:- آمنہ بٹ۔ کراچی

دوستو! ہم اپنے گھر میں احمق مشہور ہیں حالانکہ ہم ہر سال امتحان میں فرسٹ آتے ہیں، لیکن اس پر کہا جاتا ہے کہ نقل کی ہوگی۔ آپ ہی بتائیے ہے کوئی تُک۔

آج ہم بہت خوش تھے۔ ہوتے بھی کیوں نا۔ امی کی دوست کے گھر سے شادی کا دعوت نامہ آیا تھا۔ اور شادی جمعہ کو تھی۔ ہم جو اپنی طویل و عریض گرمیوں کی چھٹیوں سے سخت بیزار تھے۔ یہ سُن کر ہمارا منہ خوشی سے پھول کر گوبھی کی طرح کھل اُٹھا۔ خیر جناب جمعہ کے دن ہم صبح صبح اُٹھ بیٹھے۔ حالانکہ عام دنوں میں امی ہمیں جگا جگا کر تھک جاتی ہیں اور ہم اُٹھنے کا نام ہی نہ لیتے۔ خیر جناب، ہم تیاریوں میں مصروف ہو گئے تو وہ ہڑبونگ مچی کہ توبہ ہی بھلی۔ کسی کا جوتا غائب ہے تو کسی کا بٹن نہیں مل رہا۔ ہم تو کسی نہ کسی

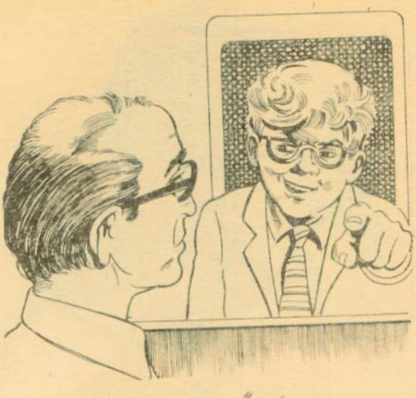

طرح تیار ہو ہی گئے۔ مگر ہائے ری قسمت ہماری باجی نے شور مچانا شروع کر دیا کہ "ہمارے موزے نہیں مل رہے۔ اور ہم موزے کے بغیر جوتا نہیں پہنیں گے۔"
جناب! ہم تو پہلے ہی بوکھلائے ہوئے تھے یہ سوچ کر کہ اور ہنگامہ نہ ہو جائے اپنے موزے باجی کو دے دیئے۔ اللہ اللہ کر کے ہم گھر سے روانہ ہوئے۔ راستے میں ہمیں احساس ہوا کہ ہڑبونگ کی وجہ سے ہم عینک پہننا بھول گئے ہیں۔ تب ہی تو ہمیں سب کے سر گیند کی طرح نظر آرہے ہیں۔ اب کیا ہوگا؟ اگر گھر والوں کو اس طرف توجہ دلاتے ہیں تو احمق کا خطاب سننا پڑے گا۔ اس خیال کے آتے ہی ہم چُپ ہو گئے۔ جیسے تیسے شادی گھر پہنچے، تحفہ ہمارے ہی ہاتھ میں تھا۔ گیٹ پر چند عورتیں آنے جانے والوں کا استقبال کر رہی تھیں۔ ہم نے سامنے کھڑی ہوئی عورت کو سلام کیا اور تحفہ دینے کے لیے ہاتھ بڑھایا تھا کہ اچانک پیچھے سے ایک زوردار تھپڑ پڑا۔ ہم نے غصے سے پیچھے مُڑ کر دیکھا تو باجی ہمیں گھور رہی تھیں۔ یہ دیکھ کر ہمارا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ تھپڑ باجی نے مارا تھا۔ کیونکہ ہم نے دلہن کی والدہ سمجھ کر تحفہ کسی اور خاتون کو پکڑا دیا تھا۔ اس میں ہماری خطا بھی کیا تھی۔ عینک کے بغیر ہمیں صاف نظر بھی نہیں آرہا تھا۔ ہم کھسیانے ہو کر دلہن کے کمرے میں چلے گئے۔

شادی میں عورتوں نے اتنے زرق برق لباس پہنے ہوئے تھے کہ ہمارے لئے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ دلہن کون ہے۔ اسی پریشانی میں اچانک ہماری نظر سامنے بیٹھی ہوئی لڑکی پر پڑی۔ ہمیں اُس کا چہرہ کچھ شناسا سا لگا۔ ہم نے اُسے اپنی دوست سمجھ کر آہستہ سے پتھر جڑ دیا۔ ہائیں! یہ کیا؟ سب ہمیں باہر کی طرف دھکیل کیوں رہی ہیں۔ ہم پریشان پریشان یہی سوچ رہے تھے کہ معلوم ہوا جسے ہم نے اپنی دوست سمجھ کر مارا تھا۔ وہ دلہن صاحبہ تھیں۔۔۔

باہر آ کر ہم نے اپنے حواس درست کئے اور دوسرے کمرے میں جا کر پلنگ پر بیٹھ گئے۔ لمحہ بھر بعد ہمیں جیسے یوں محسوس ہُوا جیسے ہم کسی اسفنج سے بھی زیادہ نرم چیز پر بیٹھ گئے ہوں۔ ابھی ہم اس بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ رونے کی آواز نے ہمیں بوکھلا دیا۔ ہم جلدی سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ کیونکہ ہم کسی خاتون کے سوئے ہوئے بچّے پر جا بیٹھے تھے۔ اس سے پہلے کہ بچّے کی والدہ ہماری دُرگت بنائیں۔ ہم نے وہاں سے دوڑ لگانے میں ہی اپنی عافیت جانی۔

خدا خدا کر کے کھانے کا وقت ہُوا تو ہم شامیانے میں جا بیٹھے۔ کھانا شروع ہُوا تو برابر بیٹھی ہوئی خاتون نے اپنے بچّے کو میز پر بٹھا دیا۔ ہمیں غصّہ تو بہت آیا۔ مگر مجبور تھے۔ اچانک بچّے نے ہماری پلیٹ پر ہاتھ مارا اور دوسرے ہی لمحے سارا سالن ہمارے کپڑوں پر بیل بُوٹے بناتا چلا گیا۔ اپنا یہ حال دیکھ کر ہم شرم سے زمین میں گڑ کر رہ گئے۔

واپسی پر گھر والے ہمارا مذاق اُڑا رہے تھے۔ ہم کیا کہتے۔ عینک کی وجہ سے ہمیں احمق کے ساتھ ایک اور خطاب سے بھی نواز دیا گیا تھا۔ اور اب ہم احمقِ اعظم کہلانے لگے تھے۔

بلّے کی سالگرہ

مرسلہ:- انجم جاوید، فیصل آباد

کچھ دُودھ ملائی لے آئیں
کچھ نان خطائی لے آئیں
حلوہ بھی پکائیں آج ذرا
بلّے کی منائیں سالگرہ

اِک لمبی لمبی ٹوپی ہو!
اِک چھوٹی سی لنگوٹی ہو
اس کو پہنائیں آج ذرا
بلّے کی منائیں سالگرہ

کُتّے کو بلائیں محفل میں
چوُزے کو بلائیں محفل میں
بلّی کو منائیں آج ذرا
بلّے کی منائیں سالگرہ

ڈھولک بھی بجائیں آج ذرا
نغمہ بھی سنائیں آج ذرا
بلّے کو نچائیں آج ذرا
بلّے کی منائیں سالگرہ

نامعلوم قربانی

ضرغام راجہ - سعود آباد ملیر کراچی

"ہونہہ منحوس کہیں کا آگیا صبح صبح منہ دکھانے اللہ جانے اب دن کیسا گزرے" محسن جیسے ہی شمسہ آپا کے کمرے میں چائے لے کر گیا۔ شمسہ آپا نے تنکتے ہوئے کہا۔

محسن کے لیے ایسی باتیں نئی نہیں تھیں۔ جب سے اُس کی والدہ اور والد کا انتقال ہوا تھا۔ اور اُس کے چچا نے اُس کے اثاثہ پر قبضہ کیا تھا۔ اُس کی یہی حالت تھی۔ وہ کبھی اس گھر میں نوکری کرتا تو کبھی اُس گھر میں۔ لوگ اُس کی کہانی سُن کر اُس کے ساتھ ہمدردی کرتے اور کچھ اُس کی کہانی کو من گھڑت سمجھ کر اُس کی توہین کرتے۔

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہُوا بڑی سڑک پر نکل گیا۔ اُسے سخت بھُوک لگی تھی۔ تین دن سے ایک نوالہ بھی اُس کے منہ میں نہیں گیا تھا۔ اُس کی نظریں کسی چیز کو تلاش کر رہی تھیں۔ جس سے وہ اپنی بھُوک مٹا سکے۔ اچانک اُس کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ اُسے اپنی مطلوبہ چیز مل گئی۔ روٹی! ہاں روٹی، وہ روٹی ہی تھی۔ شاید کسی نے رات کا بچا ہُوا کھانا سڑک کے کنارے پھینک دیا تھا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا۔ وہاں دو کتے پہلے ہی اس روٹی کے لئے لڑ رہے تھے۔ اس نے ایک بڑا پتھر اُٹھا کر کتوں کو مارا، دونوں کتے بھونکتے ہوئے بھاگ گئے۔ شاید وہ احتجاج کر رہے تھے۔ محسن نے جلدی سے روٹی اُٹھائی اور کھانے لگا۔ روٹی پیٹ میں پہنچی تو اُسے اپنی زندگی کا احساس ہُوا۔ وہ آگے بڑھ گیا۔ چلتے چلتے وہ ریلوے لائن پر پہنچا اور ریلوے لائن کے ساتھ چلنے لگا۔

اچانک اُس نے پٹڑی کے بیچ میں کوئی چیز پڑی

ہوئی دیکھی۔ وہ آگے بڑھا۔ "بم" اُس کے ذہن میں آواز اُبھری۔

"اوہ کسی شر پسند نے ٹرین اُڑانے کے لیے پٹڑی کے ساتھ بم لگا دیا ہے" وہ بوکھلا گیا۔

"اگر ٹرین یہاں آئی تو اُسے حادثہ پیش آسکتا ہے" اُس نے سوچا۔ اُسے اپنا چچا یاد آیا جو اس ٹرین سے مال لینے منڈی جاتا ہے۔ اُسے کمینہ کہنے والے بابو بھائی یاد آئے جو اس ٹرین سے اپنے کام پر جاتے ہیں اُسے شمسہ آپا یاد آئیں، جو اس ٹرین سے اپنے بیٹے کو اسکول چھوڑنے جاتی ہیں۔ اُسے ایک ایک کر کے وہ تمام لوگ یاد آگئے جن کے ساتھ اُس نے تھوڑا بہت وقت گزارا تھا اور جو اس ٹرین کے مستقل مسافر تھے۔

"تجھے ان لوگوں نے بہت ستایا ہے مرجانے دے انھیں" اُس کے اندر سے کوئی چیخا۔

"نہیں... بُرائی کا بدلہ بُرائی نہیں ہے" اس کا ضمیر چیخ اُٹھا۔

"لیکن یہ بُرائی نہیں ہے انتقام ہے... جب ٹرین اس پٹڑی پر سے گزرے گی تو..." ایک آواز محسن کو اپنے اندر گونجتی محسوس ہوئی اور وہ چیخ اُٹھا۔

"نہیں... میں کسی کو مرنے نہیں دوں گا"

"مگر ٹرین روکی کیسے جائے؟" اس نے سوچا" اگر

پولیس کو اطلاع کرتا ہوں تو ٹرین کے آجانے کا اندیشہ ہے"
محسن سوچنے لگا۔
" اس بم کو یہاں سے ہٹانا چاہیے" اس کے ذہن میں ایک خیال آیا۔
" لیکن ... لیکن یہ پھٹ گیا تو..." فوراً ہی دوسرا خیال اس کے ذہن میں اُبھرا۔

دُور سے اُس کے کانوں میں ٹرین کی سیٹی سُنائی دی۔ جلدی کر بے وقوف ورنہ کچھ نہ ہو سکے گا۔ اس کے ذہن نے کہا اور وہ فوراً بم کی طرف بڑھا اور بم اُٹھانے لگا۔ مگر شر پسندوں نے بم پٹڑی کے ساتھ باندھ دیا تھا وہ بہت پریشان ہوا کہ اب کیا کرے۔ اُس نے جلدی سے ایک نوکیلا پتھر اُٹھایا اور وہ رسّی کاٹنے لگا۔ جس سے بم پٹڑی سے بندھا ہُوا تھا۔ ٹرین قریب سے قریب تر ہوتی گئی۔ ٹرین ڈرائیور نے بھی اُسے دیکھ لیا۔ وہ سیٹی پر سیٹی مارنے لگا۔ مگر محسن اپنے کام میں مصروف رہا

رسّی کٹ گئی۔ بم نکل کر اس کے ہاتھ میں آگیا۔

اس نے پلٹ کر دیکھا، ٹرین اُس کے انتہائی قریب تھی۔ اس نے فوراً پٹڑی پر سے چھلانگ لگادی اور جیسے ہی وہ زمین سے ٹکرایا ایک زوردار دھماکہ ہُوا اور بم پھٹ گیا ساتھ ہی محسن کے جسم کے ہزاروں ٹکڑے ہو گئے۔ اس نے اپنی جان دے کر سینکڑوں مسافروں کی جان بچالی۔

دوسرے دن اخبارات میں خبر شائع ہوئی۔
"ریلوے لائن کے قریب بم پھٹنے سے ایک بچہ ہلاک، ٹرین محفوظ رہی"

یہ بات کسی کو کبھی بھی معلوم نہ ہو سکی کہ ایک بچے نے اپنی جان کا نذرانہ پیش کر کے کتنی بڑی قربانی کا ثبوت دیا۔ معلوم نہیں دُنیا میں محسن کی طرح کے کتنے لوگ ہوں گے جن کی قربانیاں کبھی بھی معلوم نہیں ہوسکیں ہمیں ایسے گم نام لوگوں کے لئے بھی دُعا کرنی چاہیے۔ ہے نا؟

مختلف ممالک کی پارلیمنٹوں کے نام

سید اعجاز احمد، ٹنڈوجام

۱۔ امریکہ :۔ امریکہ کی پارلیمنٹ کا نام کانگریس ہے۔ یہ دو حصّوں پر مشتمل ہے۔ پہلے ایوان کا نام ہاؤس آف ریپریزینٹیٹو House Of RePresentatives اور دوسرے کا نام سینٹ ہے۔

۲۔ بھارت :۔ بھارت کی پارلیمنٹ بھی دو حصّوں پر مشتمل ہے پہلے کا نام لوک سبھا اور دوسرے کا راجیہ سبھا ہے۔

۳۔ برطانیہ :۔ برطانیہ کی پارلیمنٹ بھی دو حصّوں پر مشتمل ہے۔ پہلے کا نام "ہاؤس آف کامن" اور دوسرے کا نام "ہاؤس آف لارڈز" ہے۔ اس کا کورم صرف دو ممبران پر مشتمل ہے۔

۴۔ جاپان :۔ جاپان کی پارلیمنٹ کو ڈائٹ Diet کہتے ہیں۔

۵۔ سوئیڈن :۔ سوئیڈن کی پارلیمنٹ کو ——— Riksdag کہتے ہیں۔

۶۔ ناروے :۔ ناروے کی پارلیمنٹ کو ——— Storting اسٹورٹنگ کہتے ہیں۔

۷۔ ڈنمارک :۔ ڈنمارک کی پارلیمنٹ کو Folketing کہتے ہیں۔

۸۔ اسپین :۔ اسپین کی پارلیمنٹ کو کورٹس Cortes کہتے ہیں۔

چھ درہم میں دو چانٹے

مرسلہ :۔ شائستہ انور ۔ نارتھ ناظم آباد کراچی

ایک شخص مُدّتوں کا بیمار، زندگی سے بیزار طبیب کے پاس گیا۔ اور کہنے لگا "جناب مجھے کوئی دوا دیجیے تاکہ صحت پاؤں اور آپ کی جان و مال کو دعائیں دُوں"۔

طبیب اُسے دیکھ کر سمجھ گیا کہ یہ اب محض چلتی پھرتی لاش ہے۔ صحت کی امید ذرّہ برابر نہیں۔ لہٰذا اس نے کہا "میاں تم یہ دوا دارو ترک کرو کیوں کہ اس کی وجہ سے تمہاری صحت برباد ہو رہی ہے۔ آج سے جو تمہارے جی میں آئے وہ کرو اور اپنی کسی خواہش کو مت کچلو۔ آہستہ آہستہ تمام بیماریاں جاتی رہیں گی"۔

طبیب کی بات سُن کر مریض بہت خوش ہُوا۔۔۔

طبیب کے مطب سے نکل کر مریض ٹہلتے ٹہلتے ایک نہر کے کنارے جا نکلا۔ وہاں ایک شخص بیٹھا منہ ہاتھ دھو رہا تھا۔ اُس نے اُسی روز سر پر تازہ تازہ اُسترا پھروایا تھا۔ دُھوپ میں اُس کا گنجا سر خوب چمک رہا تھا۔ یہ دیکھ کر مریض کا بے اختیار جی چاہا کہ اُس شخص کے سر پر ایک زوردار چپت مارے۔ اُسے فوراً طبیب کی ہدایت یاد آئی۔

"جو جی میں آئے کرو"، یہ خیال آتے ہی بے تکلف آگے بڑھا اور تڑاخ سے ایک زناٹے دار چپت اس شخص کی کھوپڑی پر رسید کیا۔ اس غریب کا دماغ بھنا گیا تڑپ کر اُٹھا اور ارادہ کیا کہ چانٹا مارنے والے کے دو تین گھونسے اس زور سے لگائے کہ سب کھایا پیا بھول جائے، لیکن نظر جو اُٹھائی تو سامنے ایک نحیف و نزار شخص کو پایا جس کی ایک ایک پسلی نمایاں تھی۔ اس شخص نے ہاتھ روک کر جی میں کہا۔

"اگر میں اس کے ایک گھونسا ماروں تو یہ مُلکِ عدم کا راستہ لے گا"۔ لیکن اُسے یوں چھوڑنا بھی ٹھیک نہ ہوگا"۔ غرض اُس نے بیمار کا بازو پکڑا اور کھینچتا ہوا قاضی کی عدالت میں لے گیا اور کہا کہ

"حضور، اس شخص کو گدھے کی سواری کرائی جائے یا دُرّوں کی سزا ہو اس نے بلاوجہ مجھے چانٹا مارا ہے"۔ قاضی نے کہا۔

"کیا بکتا ہے؟ یہ سزا آخر اسے کیوں دی جائے؟ تیرا دعویٰ تو ابھی ثابت نہیں ہوا۔ اس شخص کو گدھے پر بٹھانے سے کیا حاصل ہاں لکڑی کا تابوت اس کے لیے بہترین چیز ہے"۔

قاضی کی بات سُن کر اُس شخص کو اور جلال آیا۔ تڑخ کر بولا "واہ صاحب واہ! یہ عجب منطق ہے۔ یہ شخص مجھے چپت بھی مارے اور اس کی اس بے ہودہ حرکت کی کوئی سزا بھی نہ پائے۔ کیا آپ کی شریعت میں یہ جائز ہے کہ ہر راستہ ناپتا بازاری لفنگا ہم جیسے شریفوں کو چپتیاتا پھرے اور کوئی اس کا ہاتھ پکڑنے والا نہ ہو"؟

قاضی نے نرمی سے کہا۔

"تیری بات دُرست ہے"۔ ایسے شخص کو سزا ضرور ملنی چاہیے لیکن یہ تو دیکھ کہ وہ زندگی کے آخری دن پورے کر رہا ہے۔ خون کا قطرہ اُس کے بدن میں نہیں بجائے سزا کے یہ تو ہمدردی اور رحم کے لائق ہے۔ اچھا یہ بتا اس وقت تیری جیب میں کتنے درہم ہیں"؟

اس شخص نے جیب ٹٹول کر کہا "کوئی چھ سات ہوں

گے" قاضی کہنے لگا کہ
"ایسا کر کہ تین درہم ان میں سے اسے دے دے یہ شخص بہت کمزور اور مسکین شخص ہے۔ تین درہم کی روٹی کھا کر تجھے دُعائیں دے گا"
یہ سُن کر وہ شخص غصے سے بھڑ گیا اور بولا "سبحان اللہ اچھا انصاف فرمایا ہے۔ چپت بھی ہم کھائیں اور چپت مارنے والے کو تین درہم بھی اپنی جیب سے ادا کریں"۔
غرض قاضی اور گنجے شخص میں تکرار ہونے لگی ادھر اس بیمار کی عجب کیفیت تھی۔ جب سے اُس نے قاضی کا گنجا سر دیکھا تھا۔ اُس وقت سے برابر ہاتھ میں کھُجل ہو رہی تھی۔ اس کی چاند پہلے شخص کی چاند سے بھی زیادہ چکنی اور صاف تھی۔ آخر دل کی بات ماننا پڑی۔ ایک ضروری بات قاضی کے کان میں کہنے کے بہانے سے مسند کے نزدیک آیا۔ اور اس زور سے قاضی کی چندیا پر چپت رسید کیا کہ اس کا منہ پھر گیا۔ پھر بولا۔
"وہ چھ درہم تم دونوں آپس میں بانٹ لو اور مجھے چھوڑ دو" یہ کہہ کر وہاں سے چلا" قاضی کا غصے کے مارے بُرا حال تھا چاہا کہ اس کو پکڑ کر غلاموں سے دُرّے لگوائے کہ پہلا شخص چلایا۔
"ہائیں ہائیں یہ کیا غضب کرتے ہو۔ اجی حضر آپ کا حکم تو عین انصاف ہے۔ اس میں شک و ش کی کہاں گنجائش۔ جو بات آپ اپنے لئے پسند نہیں فرما وہی بات میرے حق میں کیسے پسند فرما رہے تھے؟"
(حکایات رومی سے انتخاب)

اعلان

جنوری ۱۹۹۰ء کا شمارہ **خوفناک نمبر** ہو گا ننھی نگارشات کے صفحات کے لئے آپ ہمیں اپنی خوفناک کہانیاں، مضامین اور خوفناک واقعات وغیرہ جلد از جلد ارسال کر دیں۔ **خوفناک نمبر** کے حوالے سے ننھی نگارشات کے صفحات کے لئے آنے والی ہر قابلِ اشاعت تحریر کا معقول معاوضہ دیا جائے گا۔

(ادارہ)

دُنیا کا پُرانا اخبار

شاید آپ کو یہ بات معلوم نہ ہو کہ دنیا کا سب سے پرانا اخبار پیکنگ گزٹ ہے۔

ساتویں آسمان پر مسجد

ایک مسجد جو کہ ساتویں آسمان پر موجود ہے اس کا نام بیت المعمور ہے۔

بلیک بکس

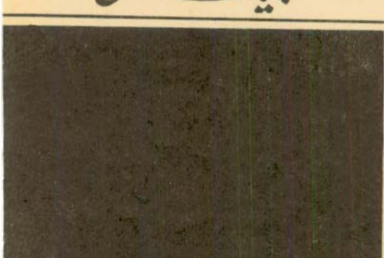

"اگر آپ مستقبل کے اچھے اور نیک نام ادی بننا چاہتے ہیں تو کوشش کیجیے کہ آپ کا نام بلیک بکس میں نہ آنے پائے"

سالگرہ کے ساتھی

ماہ اکتوبر میں پیدا ہونے والے ساتھیوں کا تعارف

عمران اختر ، ہفتم
یکم نومبر ۱۹۷۴ء
کرکٹ کھیلنا ، انگلش
کرکٹر
۱۱/اے جیل روڈ نزد شاہین ہیلتھ کلینک کراچی ۵

زاہد حسین ، پنجم (ب)
۶ ر نومبر ۱۹۷۷ء
پڑھائی ، اُردو ، پیلٹ
بنیں گے ۔
زاہد حسین جماعت پنجم ، گورنمنٹ ہائی اسکول اکبر

محسن علی قاسمی ، ششم
یکم نومبر ۱۹۷۶ء
کرکٹ اور رسالہ آنکھ مچولی
پڑھنا ، ڈرائنگ ، آرٹسٹ ۔
ا ر ٹی / ۶۶ بیرک جٹ لائن ۔ لائنز کراچی نمبر ۳

شاہد گل سموں ، دہم
۷ ر نومبر ۱۹۷۷ء
آنکھ مچولی پڑھنا ، انگریزی
پائلٹ ۔
دارالعلوم ہائی اسکول ٹنڈو محمد خان

یونس احمد ، نہم
۳ ر نومبر ۱۹۷۵ء
کرکٹ کھیلنا ، قلمی دوستی
سائنس ، عمران خان
مکان نمبر ۵ ۔ جے ۔ بی ہائیڈ جیکب لائن کراچی

مصطفےٰ جیب ، دہم
۱۰ ر نومبر ۱۹۷۳ء
کتب پڑھنا ، اسلامیات
جو خدا کو منظور ہوگا ۔
مرغائی تحصیل و ضلع راجن پور

محمد ریاض الیاس دہم
۱۰ نومبر ۱۹۷۳ء
باسکٹ بال کھیلنا،
انگلش، ڈاکٹر
معرفت حافظ کاپی ہاؤس اینڈ بک ڈپو عید گاہ روڈ ہارون آباد

اویس خان خانزادہ، ہفتم
۱۱ نومبر ۱۹۷۷ء
فٹ بال کرکٹ، سائنس
انجینئر بنیں گے۔
۲۵-ایف صدیق پلازہ لطیف آباد حیدرآباد

سید علی ابرار دہم
۱۲ نومبر ۱۹۷۰ء
قلمی دوستی، ٹکٹیں جمع کرنا
انگلش، ایڈووکیٹ
۲۴۰/بی ہاشمی کالونی یونٹ نمبر ۲ لطیف آباد حیدرآباد

سید محمد علی رضا، ہفتم
۱۳ نومبر ۱۹۷۸ء
آنکھ مچولی پڑھنا، اردو
پائیلٹ
بی-۱۷۰ مصطفے آباد ملیر سٹی کراچی

ناصر محمود نہم بی
۱۶ نومبر ۱۹۷۴ء
کرکٹ، قلمی دوستی، ٹکٹیں
جمع کرنا، بیالوجی، ڈاکٹر
ناصر محمود کھوکھر چوک گلی نمبر ۱۸ اے سنگھپورہ فیصل آباد

محمد افضال ملک ہفتم
۱۶ نومبر ۱۹۷۷ء
کرکٹ کھیلنا، اسلامیات
کرکٹر مکان نمبر ۲ گلی نمبر ۱ محمد دین اسٹریٹ
وحدت کالونی۔ لاہور

غلام فاروق، دہم
۱۴ نومبر ۱۹۷۴ء
والی بال کھیلنا، آنکھ مچولی
پڑھنا، اسلامیات۔ فوجی افسر
نزد بنگلہ دیوان صاحب جلال پور پیروالہ ضلع ملتان

سید نسیم الحق، ہفتم
۲۱ نومبر ۱۹۷۷ء
کمپیوٹر رشڈ ڈیزائن، ٹکٹ اور
سکے جمع کرنا۔ انگلش، وکیل
۴۴۱-بی سیکٹر ۸، نارتھ کراچی، کراچی

ابراہیم شاہ، ہشتم
۲۲ نومبر ۱۹۷۴ء
رسالے پڑھنا، اسلامیات
معزز شہری
شہر کراچی لانڈھی نمبر ۲۲ راشن نمبر ۲۰۴۲

محمد ارشد منہاس، نہم
۲۶ نومبر ۱۹۷۶ء
ہاکی کھیلنا، مطالعہ کرنا
اسلامیات، آرمی آفیسر
۹۰-اے عالمگیر سوسائٹی ماڈل کالونی، کراچی

سلمان مراد، نہم
۲۷ نومبر ۱۹۷۵ء
ڈاک ٹکٹ اور سکے جمع
کرنا، ریاضی، سائنس دان
۴۰-ڈی پی ناظم آباد نمبر ۳، کراچی

محمد علی کھتری، نہم
۲۹ نومبر ۱۹۷۳ء
رسالہ پڑھنا، سائنس،
پاکستانی فوجی
کوارٹر نمبر ۱۲ بلاک ۱۲۵-۱۱جی، نیو کراچی، کراچی

قلمی دوستی میں شرکت کا کوپن اس شمارے میں موجود کوپن کے علیحدہ صفحے سے کاٹیے

ایک دُعا

(ابن انشا کی تحریر سے اقتباس)

یا اللہ
کھانے کو روٹی دے!
پہننے کو کپڑا دے!
رہنے کو مکان دے!
"میاں یہ بھی کوئی مانگنے کی چیز ہے؟ کچھ اور مانگا کرو۔"

"باباجی آپ کیا مانگتے ہیں؟"
"میں، میں یہ چیز نہیں مانگتا۔ میں تو کہتا ہوں۔ اللہ میاں مجھے ایمان دے۔ نیک عمل کی توفیق دے!"
"باباجی آپ ٹھیک دعا مانگتے ہیں، انسان وہی چیز تو مانگتا ہے جو اس کے پاس نہیں ہوتی۔"

امّی ابوّ کا صفحہ

اُمِّ رمیصاءُ

اس بار ہمارے مخاطب تمام امّی ابو نہیں ہیں بلکہ صرف ایسے ابو ہیں جنہیں سگریٹ پینے کی عادت ہے اور وہ تمام مائیں ہیں جو اپنے شوہروں کو سگریٹ پینے سے باز نہیں رکھ سکتیں۔

امّی ابو کے اس صفحے پر ہم نے بارہا آپ کو یہ مشورہ دیا ہے کہ آپ بچّوں کے لئے جب تک قابلِ تقلید نمونہ نہیں بنیں گے۔ اُس وقت تک اُن کی بہتر تربیت کے لئے آپ کی تمام کوششیں اور منصوبہ بندیاں پوری طرح مؤثر نہیں ہو سکیں گی۔

آپ خود سگریٹ پیئیں اور بچے کو اس عمل سے باز رہنے کی ترغیب دیں۔ ایسے میں آپ خود سوچئے کہ آپ کی بات میں کتنا اثر ہوگا۔ اور آپ کی یہ دو عملی بچے کے ذہن پر کیا اثرات مرتّب کرے گی ---؟

مانا کہ سگریٹ نوشی ایک ایسی لت ہے کہ جسے اکثر لوگ بُرا سمجھتے ہوئے بھی محض اپنے ضعیف ارادے کی وجہ سے ترک نہیں کر سکتے، لیکن سوچئے کہ آپ کی کمزور شخصیت آپ کے بچّوں میں کیسی کیسی کمزوریاں اور مسائل پیدا کر سکتی ہے۔

بس آج سے طے کر لیجئے کہ آپ سگریٹ نہیں پیئیں گے۔ اپنے بچّوں کی خاطر اور ان کے بہتر مستقبل کی خاطر۔

اور پھر ... سگریٹ پیتے ہوئے آپ یہ بات کیوں بھُول جاتے ہیں کہ سگریٹ کا دُھواں صرف آپ ہی کو نہیں سُلگا رہا بلکہ اس کا دُھواں دار زہر ماحول کو آلودہ کر کے سانسوں کے ذریعے آپ کے بچّوں اور اہلِ خانہ کے اندر بھی اُتر رہا ہے۔

یاد رکھئے یہ غیر محسوس زہر اکثر آپ کے بچّوں کی بیماریوں کا سبب بھی بنتا رہتا ہے۔ مگر آپ کو اس کا علم نہیں ہوتا۔

لطف - لذّت - ذائقہ
هوئیسٹ
ڈراپس
گلے کی خراش میں
بیحد مفید
گلے میں خراش - ہوئیسٹ کی تلاش
اور سب ٹھنڈا ٹھنڈا
HOEST DROPS
delicious
cool
refreshing
TIPOO ENTERPRISES FAISALABAD
MASS

REGD. NO. M-266 NOVEMBER 1989

MONTHLY AANKH MICHOLLE KARACHI